سوادِ اعظم کیا ہے؟

تالیف

حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی تھانوی نَوَّرَ اللّٰہُ مَرقَدَہٗ

نوائے غزوۂ ہند
مطبوعات

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

نامِ کتاب	سوادِ اعظم کیا ہے؟
مصنف کا نام	حضرت علّامہ ظفر احمد عثمانی تھانوی نوّر اللہ مرقدہٗ
تاریخِ اشاعت	۲۲ رمضان المبارک ۱۴۴۶ھ / ۲۲ مارچ ۲۰۲۵ء
ناشر	ادارہ نوائے غزوۂ ہند
برقی پتہ برائے رابطہ	editor@nghmag.com

سوادِ اعظم کیا ہے؟

حضرت علّامہ ظفر احمد عثمانی تھانوی نوّر اللہ مرقدہٗ

نوائے غزوۂ ہند
مطبوعات

حرفِ اوّل

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وكفى والصلاة والسلام على رسول الله، أما بعد!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ایک فرمان کو بنیاد بناتے ہوئے ”...... تم سوادِ اعظم کا ساتھ دو...... الخ“، **یہ خیال راسخ وعام ہو رہا ہے کہ شرعی معیارات سے قطعِ نظر، جس طرف زیادہ لوگ ہیں، وہی ”جماعتِ حق“ ہے۔** اسی خیالِ فاسد کی اصلاح کے لیے فقہِ حدیث کی مایۂ ناز کتاب ”اعلاء السنن“ کے مؤلف، المحدث، الفقیہ، علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب تھانوی (نوّر اللہ مرقدہٗ) کی تحریر پیشِ خدمت ہے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ اہلِ حق گو قلیل ہی کیوں نہ ہوں، ان کا ساتھ درحقیقت سوادِ اعظم (جماعت) کا ساتھ ہے، اور اہلِ باطل خواہ کثیر ہی کیوں نہ ہوں، ان کا ساتھ دراصل جماعت سے افتراق اور ناحق کی اتباع ہے۔ یہاں اس بات کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ **یہاں علماء و اہلِ دین کی جماعتِ کثیرۃ کی ہر معاملے میں اتباع یا ساتھ کی بات کی جارہی ہے نہ کہ اس وقت رائج دنیا کے معروف و مشہور نظام ’جمہوریت‘ کی جس میں جہلاء اور بے دین لوگوں کی اکثریت بھی واجبِ اتباع سمجھی جاتی ہے۔ پھر یہ بات بھی درجِ ذیل تحریر کے مطالعے سے واضح ہو جائے گی کہ شرعی معیارات کی قید لگائے بغیر محض علماء و اہلِ دین کی کثیر تعداد کی اتباع ’سوادِ اعظم‘ یا ’دنیوی و اخروی‘ فلاح نہیں ہے تو جمہوری نظام میں نیک و بد اور عالم و جاہل کی قید کے بغیر کثرت کی پیروی کیسے فلاح کا ذریعہ ہو سکتی ہے؟**

’سوادِ اعظم‘ کا ایک موہوم تصور و فہم اگر یہ اس جدید جمہوریت میں اترنا ہے (جس کا رد اسی تحریر میں حضرت العلامۃ نے کیا ہے)، **تو ایسا ہی تصور کسی اور جگہ پر بھی پایا جاسکتا ہے، جہاں کوئی ایک گروہ محض تعداد کی بنیاد پر اپنے آپ کو ’سوادِ اعظم‘ سمجھتا ہو اور دین کی خدمت و محنت کرنے والی باقی دعوتی و جہادی جماعتوں کو ’سوادِ اعظم‘ کا مخالف یا ’سوادِ اعظم‘ سے نکلا ہوا سمجھتا ہو۔ یہ تصور بھی درست نہیں، جیسا کہ آگے موجود حضرت العلامۃ (نوّر اللہ مرقدہ) کے فتوے سے معلوم ہو جائے گا کہ انتظامی امور میں ایسی تصریح درست نہیں، خاص کر کہ جب ایسا گروہ متغلب و شرعی حاکم نہ ہو،** نیز حاکم کے اتباع کی شرعی حیثیت پر بھی کچھ بات اس تحریر میں موجود ہے۔

یہ تحریر ’فقہ و فتاویٰ‘ کی مشہور کتاب ’امداد الاحکام‘ سے اخذ کردہ ہے جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی (قدس سرہٗ) کی زیرِ نگرانی تالیف و ترتیب دی گئی ہے۔ ترتیبِ نو کرتے ہوئے ہمارے ساتھی مولانا ابو مثنیٰ عبد الکبیر (مد ظلہ) نے پرانے حوالہ جات کو برقرار رکھتے ہوئے نئی تخریجات بھی درج کر دی ہیں۔ اللہ پاک اپنے دین کے مبادی و مفاہیم اہلِ ایمان میں عام فرمائیں اور ہمیں بخش دیں، آمین یا ربّ العالمین!

و صلى الله تعالىٰ على النبى، وآخر دعوانا أن الحمدلله ربّ العالمين

مدیر

ادارہ ’نوائے غزوۂ ہند‘

۲۲ رمضان المبارک ۱۴۴۶ھ / ۲۲ مارچ ۲۰۲۵ء

☆☆☆☆☆

سوادِ اعظم کیا ہے؟

سوال: باہم علماء میں جب اختلاف ہو کہ علماء کی کثیر جماعت کسی مسئلے میں ایک طرف ہو اور معدودے چند علماء اس سے اختلاف رکھتے ہوں اور ہر ایک اپنے مسلک کی صحت پر دلائلِ شرعیہ قائم کرتا ہو، ایسی صورت میں مسلمانوں کو جماعتِ کثیرہ کا اتباع کرنا واجب ہے یا جماعتِ قلیلہ کا اتباع بھی جائز ہے؟ بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ جماعتِ کثیرہ کا اتباع واجب ہے اور دلیل میں یہ احادیث پیش کرتے ہیں:

وعن علي قال: قلت: يا رسول الله! إن نزل بنا أمر ليس فيه بيان أمر ولا نهي فما تأمرنا؟ قال: شاوروا[1] فيه الفقهاء والعابدين ولا تمضوا فيه رأي خاصه۔ رواه الطبراني في الأوسط ورجاله موثقون من أهل الصحيح (مجمع الزوائد ج١ ص ١۷)

حضرتِ علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ ہمارے سامنے اگر ایسا معاملہ آجائے کہ جس میں (آپ کی طرف سے کسی معاملے/کام کو کرنے یا نہ کرنے کا) حکم نہ ہو تو ہم کیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس میں تمہارے فقہاء اور عبادت گزار لوگ مشورہ کریں اور (مشورہ کے بغیر) کسی خاص رائے کی طرف مت جائیں۔“

عن أَنَس، يقول: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: إنّ أمّتي لا تجتمع على ضلالة، فإذا رأيتم اختلافاً، فعليكم بالسّواد الأعظم (ابن ماجه ص ٢٩٢، ٢٩١ وفى العزيزي قال الشيخ حديث صحيح ج٢ ص ٢٥۷)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ”بلا شبہ میری امت گمراہی پر مجتمع (متفق) نہ ہو گی۔ جب تم اختلاف دیکھو تو سوادِ اعظم (قرآن و سنت پر عمل پیرا) کا ساتھ دو“۔

---

[1] الطبراني في الأوسط میں یہ الفاظ مذکور ہیں: عن علي قال قلت: يا رسول الله! إن نزل بنا أمر ليس فيه بيان أمر ولا نهي فما تأمرنا؟ قال تشاورون الفقهاء والعابدين ولا تمضوا فيه رأي خاصة۔

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ، وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ، وَهُوَ مِنَ الِاثْنَيْنِ أَبْعَدُ، وَمَنْ أَرَادَ بُحْبُحَةَ الْجَنَّةِ فَعَلَيْهِ بِالْجَمَاعَةِ (رواه الترمذي عن ابن عمر مرفوعا وقال حديث صحيح حسن غريب ج٢، ص ٣٩)

”جماعت کو لازم پکڑو اور تفرقے سے بچے رہو، شیطان ایک کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ دو سے زیادہ دور ہوتا ہے، جو جنت کا آرام چاہے تو اس کو جماعت کا ساتھ دینا چاہیے۔ “

ان احادیث سے جماعتِ کثیرہ کا اتباع لازم اور فقہا و عابدین سے مشورہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کی رائے کا اتباع کرنے سے حدیثِ اول منع کرتی ہے۔ پس حدیث و فقہ سے یہ بتلا دیا جائے کہ مسائلِ شرعیہ میں جب علماء اختلاف کریں تو کیا واحد کی رائے صحیح ہو سکتی ہے اور اس کی اتباع جائز ہے۔ بیّنوا توجروا۔

سائل: ایک مسلمان

الجواب: والله الموفق للصواب

علماء میں جب اختلاف ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں: یا وہ اختلاف احکامِ شرعیہ و مسائلِ دینیہ میں ہے یا فروع میں۔ اسی طرح شق ثانی کی بھی دو صورتیں ہیں: یا مسلمانوں کا کوئی امام ہو یا امام نہ ہو۔ صورت اولیٰ کی دوسری قسم میں یعنی جبکہ اختلاف مسائل شرعیہ فرعیہ میں ہو، جماعتِ کثیرہ کا اتباع لازم نہیں۔ جماعتِ قلیلہ یا عالمِ واحد کی رائے جمہور کے خلاف بھی ہو تب بھی اس میں احتمال صواب کا اسی طرح ہے جس طرح جمہور کی رائے میں احتمال صواب کا ہے۔

۱.) علمائے امت کا زمانۂ صحابہ سے اس وقت تک یہ تعامل چلا آرہا ہے کہ انہوں نے مسائل مختلف فیہا میں کسی امام کے قول کو اس وجہ سے ترک نہیں کیا کہ یہ قول جمہور کے خلاف ہے اور شخصِ واحد یا جماعتِ قلیلہ کا قول ہے۔

قال ابن القيّم فى زاد المعاد: وأما المقام الثاني: وهو أن الجمهور على هذا القول، فأوجدونا فى الأدلة الشرعية أن قول الجمهور حجّةٌ مضافة إلى كتاب الله وسنة رسوله، وإجماع أمته۔ ومن تأمَّل مذاهب العلماء ء قديماً

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں فرمایا ہے:
”رہا دوسرا مقام، وہ یہ کہ جمہور کا قول یہی ہے م تو اس سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ ہم نے دلائلِ شرعیہ میں کہیں یہ بات پائی نہیں کہ قولِ جمہور بھی کوئی ایسی حجت

وحديثاً من عهد الصحابة وإلى الآن، واستقرأ أحوالهم وجدهم مجمعين على تسويغ خلاف الجمهور، ووجد لكل منهم أقوالا عديدة انفرد بها عن الجمهور، ولا يستثنى من ذلك أحد قط، ولكن مستقلٌّ ومستكثر، فمن شئتم سميتموه من الأئمة تتبّعوا ما له من الأقوال التي خالف فيها الجمهور، ولو تتبعنا ذلك و عددناه، لطال الكتاب به جداً، ونحن نحيلكم على الكتب المتضمنة لمذاهب العلماء واختلافهم، [2] (ج٢، ص٢٥١)

ہے جو کتاب اللہ و سنت رسول و اجماع امت کے ساتھ ملحق ہو۔ اور جس نے مذاہبِ علماء میں تأمل کیا ہے، خواہ وہ متقدمین ہوں یا متاخرین، صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک جتنے بھی علماء ہوئے ہیں اور ان کے احوال کا تتبع کیا ہے، وہ ان سب کو جمہور کی مخالفت کے جواز پر اجماع کیے ہوئے پائے گا اور ہر ایک کے متعدد اقوال اس کو ایسے ملیں گے جن میں وہ جمہور سے الگ ہے اور اس کلیہ سے ہر گز کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہاں، بعضے جمہور کی مخالفت کم کرتے ہیں اور بعض زیادہ کرتے ہیں، بس اتنا ہی فرق ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

پس تم ائمہ میں سے جس کا نام چاہو لے لو، پھر اس کے ان اقوال کا تتبع کرو جن میں اس نے جمہور کی مخالفت کی ہے، تو تم کو ایسے اقوال ہر امام کے پاس ملیں گے۔ اور اگر ہم ان کو تلاش کرنا اور گننا شروع کریں تو کتاب بہت زیادہ طویل ہو جائے گی۔ اور ہم تم کو ان کتابوں کے حوالے کرتے ہیں جن میں مذاہب علماء اور ان کے اختلافات کا ذکر موجود ہے۔“

علامہ ابنِ قیم رحمہ اللہ کی یہ عبارت صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ مسائل فرعیہ میں مخالفت جمہور کے جواز پر علمائے امت کا صحابہ سے لے کر اس وقت تک ہر زمانہ میں اجماع رہا ہے اور کوئی امام مخالفتِ جمہور سے بچا ہوا نہیں، ہر امام

---

[2] زاد المعاد في هدي خير العباد۔ المجلد الخامس۔ فصل حكم رسول الله صلى الله عليه وسلم فى الطلاق قبل النكاح۔ الناشر: مؤسسة الرسالة، بيروت۔ مكتبة المنار الإسلامية، الكويت

کے متعدد اقوال جمہور علماء کے خلاف موجود ہیں جن کو اس کے مقلدین نے مخالفتِ جماعتِ کثیرہ کی وجہ سے ہر گز رد نہیں کیا، اور حنفیہ کے تو بہت سے مسائل اس شان کے ہیں جن میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ جمہور امت سے متفرد ہیں جیسے نفاذ قضاء قاضي ظاهراً وباطناً وجواز ربوا في دارالحرب وقول بالمثلين في وقت الظهر وغیرہ اور ان اقوال کو حنفیہ نے اس عذر کی وجہ سے کبھی رد نہیں کیا کہ امام صاحب اس میں متفرد ہیں۔

۲.) لا يزال طائفةٌ من أمّتي على الحقّ منصورين لا يضرّهم من خالفهم حتّى يأتي أمر الله عزّ وجلّ (سنن ابن ماجه- باب اتباع سنّة رسول الله صلى الله عليه وسلم...) [۳]

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ "میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہے گی جس کی حق پر مدد کی جاوے گی اور ان کو وہ لوگ ضرر نہ دے سکیں گے جو ان کے مخالف ہوں گے، یہاں تک کہ خدا کا حکم یعنی قیامت آجاوے۔"

طائفة من الشئ [۴] قطعہ شے کا ہوتا ہے جو قلّت پر دلالت کرتا ہے۔ پس حضور فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ارشاد ہے کہ طائفۂ قلیلہ خواہ رجلِ واحد ہی کیوں نہ ہو، حق پر ہو سکتا ہے اور اس کے مخالف تمام دنیا بھی ہو تو اس کا قول باطل ہو گا۔

قال في مجمع البحار: الطائفة: الجماعة من الناس- وتقع على الواحد، كأنه أراد نفسا طائفة- وسئل إسحاق بن راهويه عنه فقال: الطائفة دون الألف، وسيبلغ هذا الأمر إلى أن يكون عدد المتمسكين بما كان عليه رسول الله-صلى الله عليه وسلم- وأصحابه ألفا،

مجمع البحار میں کہا گیا ہے کہ "طائفہ آدمیوں کی ایک جماعت کو کہتے ہیں اور شخصِ واحد پر بھی اس کا اطلاق آتا ہے۔ اسحاق ابن راھویہ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: طائفہ ایک ہزار سے کم کو کہتے ہیں، اور عن قریب یہ دین اس حالت کو پہنچ جائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے

---

[۳] اگرچہ امداد الاحکام میں حدیث کا حوالہ رواہ المسلم وغیرہ مذکور ہے، مگر چونکہ یہ حدیث بعینہٖ ان الفاظ کے ساتھ ہمیں ابن ماجہ میں ملی ہے اس لیے اسے ذکر کیا گیا ہے، البتہ اس سے ملتے جلتے الفاظ و معانی پر مشتمل احادیث بخاری و مسلم میں بھی موجود ہیں۔

[۴] اس حدیث کی تقریر براہینِ قاطعہ مصنفہ قطب عالم مولانا گنگوہی قدس سرہ میں قابل ملاحظہ ہے۔ ۱۲ منہ

يسلي بذلک أن لا يعجيهم كثرة أهل الباطل۔ (ج۱، ص ۳۳) [5]

طریقے کے ساتھ تمسک کرنے والے ہزار (کے قریب) رہ جائیں گے۔ اس حدیث سے آپ نے ان لوگوں کو تسلی دی ہے کہ وہ اہل باطل کی کثرت سے تعجب نہ کریں۔“

اس میں صاف تصریح ہے کہ اہلِ حق قلیل اور اہلِ باطل کثیر ہو سکتے ہیں۔ پس کسی کی طرف مسئلۂ شرعیہ میں جماعتِ کثیرہ کا ہونا اس کے حق پر ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

۳.)قال النبي صلى الله عليه وسلم: إنّه من أحيا سنّة من سنّتي قد أميتت بعدي فإنّ له من الأجر مثل من عمل بها۔ الحديث؛ قال الترمذي حسن [6] (مشكوة مع التنقيح ج۱، ص۴۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جو شخص میری سنتوں میں سے ایسی سنت کو زندہ کرے جو میرے بعد مردہ کردی گئی تھی، اس کے لیے اس قدر ثواب ہے جتنا اس سنت پر سب عمل کرنے والوں کو ملے گا، یعنی اس کو تنہا سب کی مجموعی مقدار کے برابر ثواب ملے گا۔“

ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

من أحيا عام ہے جو کہ واحد کو بھی شامل ہے بلکہ آئندہ کلام میں ضمیر واحد کا اس کی طرف راجح ہونا ارادۂ واحد کو مرجح ہے۔ نیز سنت کی اماتت کے معنی یہی ہیں کہ عام طور سے اس پر عمل متروک ہو گیا ہو، اس حالت میں اس کا احیا کرنے والا شخصِ واحد یا جماعتِ قلیلہ ہی ہو گا۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ کسی زمانہ میں متبع سنت قلیل اور مخالف سنت کثیر ہوں گے، لہٰذا کسی طرف جماعتِ کثیرہ کا ہونا اس کی حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

---

[5] كذا في لسان العرب ((حرف الطاء)) طوف

[6] سنن الترمذي۔ كتاب العلم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ باب ما جاء في الأخذ بالسّنّة واجتناب البدع

۴.)قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ”من تمسّک بسنّتي عند فساد أمّتي فله أجر مائة شهيد۔“ رواه فى المشكوة وفى التنقيح رواه ايضا الطبراني[7] باسناد حسن۔ (ج۱، ص۴۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جو شخص میری امت کی حالت خراب ہونے کے وقت میرے طریقے پر جما رہے اس کے لیے سو شہیدوں کا ثواب ہے“۔ تنقیح الرواۃ میں ہے کہ اس حدیث کو طبرانی نے بھی اسناد حسن سے روایت کیا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک زمانے میں اکثر امت فساد میں مبتلا ہو جائے گی اور متبع سنت بہت کم ہوں گے، اس لیے ان کی اس درجہ فضیلت ہے۔ لہٰذا ایسے زمانہ میں کسی جانب علماء کی کثرت ہرگز حقانیت کی دلیل نہ ہوگی، کیونکہ اس وقت علماء کا بھی زیادہ حصہ فسادِ اہوا میں مبتلا ہوگا، ان میں متبع سنت کم ہوں گے۔ كما هو مشاهد۔

۵.) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ”من أكل طيباً، وعمل في سنّةٍ، وأمن النّاس بوائقه، دخل الجنّة“، فقال رجل: يا رسول الله! إنّ هذا اليوم فى النّاس لكثير، قال: ”وسيكون في قرون بعدي“۔ رواه الترمذي وأيضا فى المشكوة، وفي تنقيح الرواة بعد الفحص له احتجاج واخرجه ايضا الحاكم واسناده صحيح، (ج۱، ص۴۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جو شخص حلال روزی کھاتا رہے اور سنت کے موافق عمل کرتا رہے اور لوگ اس کی آفات سے محفوظ رہیں، وہ جنت میں داخل ہوگا“۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آج کل تو ایسے لوگ بہت ہیں! آپ (علیہ الصلاۃ والسلام) نے فرمایا: ”عن قریب میرے بعد قرنوں میں ایسا آدمی ہوا کرے گا“۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور صاحبِ مشکوۃ نے بھی۔ تنقیح الرواۃ میں اس کے رجال پر بحث کرکے کہا ہے کہ حدیث احتجاج کے قابل ہے اور اس کو حاکم نے بھی تخریج کیا ہے اور اس کی اسناد صحیح ہیں۔

---

[7] والفاظ الطبرانى: ”المتمسّک بسنّتي عند فساد أمّتي له أجر شهيد“۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ متبعِ سنت قرون مابعد میں قلیل ہوں گے۔ اس کی تائید حدیث خير القرون قرني، ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم، ثم يفشوا الكذب، سے بھی ہوتی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ ایسے زمانہ میں کثرت اہلِ باطل ہی کی ہوگی، اہلِ حق قلیل ہوں گے۔ لہٰذا کسی طرف جماعت کثیرہ کا ہونا اس کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے۔

٦.)عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: ”سيأتي عليكم زمانٌ لا يكون فيه شيءٌ أعزّ من ثلاث: درهمٌ حلالٌ أو أخٌ يستأنس به أو سنّةٌ يعمل بها“، رواه الطبرانى فى الاوسط فيه روح ابن صلاح، ضعفه ابن عدى، وقال الحاكم ثقة مامون، وذكره ابن حبان فى الثقات، بقية رجاله موثوقون (مجمع الزوائد ج١، ص ٦٩)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ”عن قریب تم پر ایسا زمانہ آئے گا جس میں تین چیزوں سے زیادہ کوئی چیز نایاب نہ ہوگی، (ایک) درہمِ حلال، (دوسری) یا ایسا بھائی جس سے انس حاصل کیا جاوے، (تیسری) یا ایسی سنت جس پر عمل کیا جاوے“۔ اس کو طبرانی نے معجم الاوسط میں روایت کیا ہے اور اس میں (ایک راوی) روح ابن صلاح ہے جس کو ابن عدی نے ضعیف کہا ہے اور حاکم نے ثقہ و مامون کہا ہے اور ابن حبان نے بھی اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور بقیہ رجال سب ثقات ہیں۔

اس حدیث میں جس زمانہ کی خبر دی گئی ہے، کوئی صاحبِ بصیرت شک نہیں کر سکتا کہ یہ زمانہ اس کا مصداق ہے، اور حدیث میں تصریح ہے کہ اس وقت عمل بالسنّت بہت نادر ہوگا۔ لہٰذا ایسے زمانہ میں اہلِ باطل ہی کی کثرت ہوگی؛ پس کثرتِ قائلین حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

٧.)عن ابن عباس رضى الله عنهما: ”ما أتى على النّاس عام إلّا أحدثوا فيه بدعة، وأماتوا فيه سنّة، حتى تحيا البدع وتموت السنن“۔ (رواه الطبرانى فى المعجم الكبير: ٢٦٢/١٠،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”لوگوں پر کوئی سال نہیں گزرتا مگر وہ اس میں ایک بدعت ایجاد کر لیتے ہیں اور ایک سنت کو مردہ کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ بدعت ہی زندہ رہے گی اور سنتیں

وقال الهيثمي في مجمع الزوائد ١٨٨/١: ورجاله موثقون)۔

سب مردہ ہوجائیں گی"۔ اس کو طبرانی نے ایسی سند سے روایت کیا ہے جس کے رجال ثقات ہیں۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ زمانۂ نبوت سے جس قدر بُعد ہوتا جائے گا، بدعت کی کثرت اور سنت کی قلت ہوتی جائے گی اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کسی جانب میں اکثر کا ہونا ہرگز دلیلِ حقانیت نہیں ہو سکتی۔

٨.) عن ابن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "ما اختلفت أمّة بعد نبيها إلا ظهر أهل باطلها على أهل حقّها" رواه الطبرانى فى الاوسط وفيه موسى ابن عبيدة وهو ضعيف اهـ۔ (مجمع الزوائد ج١، ص٦٢) قلتُ وثقه ابن سعد وحدث عنه وكيع وقال كان ثقة كذا فى التهذيب ج١٠، ص٥٩ والاختلاف فى التوثيق لا يضر

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی امت نے اپنے نبی کے بعد اختلاف نہیں کیا مگر ان کے اہل باطل اہل حق پر غالب ہوئے (یعنی کثرت وغیرہ میں)"۔

اس کو طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اور اس میں موسی بن عبیدہ کو ضعیف شمار کیا گیا ہے، جبکہ میں کہتا ہوں انہیں ابن سعد نے ثقہ کہا ہے اور وکیع نے ان سے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ ثقہ تھے، تہذیب التہذیب میں اسی طرح ہے اور توثیق میں اختلاف مضر نہیں ہوتا۔[۸]

اس حدیث میں تصریح ہے کہ جب امت میں اختلاف ہو گا تو اہل باطل اہل حق پر (بکثرت) غالب ہوں گے۔ لہٰذا کثرتِ قائلین حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

---

[۸] بہت سے ائمہ نے موسیٰ بن عبیدہ کی تضعیف کے باوجود صدوق میں سے شمار کیا ہے اور زیادہ تر نے ان کی عبد اللہ بن دینار سے روایت پر جرح کی ہے؛ امام ابوداود سجستانی فرماتے ہیں: أحاديثه مستوية إلا أحاديثه عن عبدالله بن دينار۔ از ابوشئی عبد الکبیر

٩.) عن علي بن ابى طالب رضى الله عنه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ”يوشک أن يأتي على النّاس زمان لا يبقى من الإسلام إلا اسمه، ولا يبقى من القرآن إلا رسمه، مساجدهم عامرة، وهي خرابٌ من الهدى، علماء ؤهم أشرّ من تحت أديم السّماء، من عندهم يمدح الفتنة“۔ رواه البيهقى في شعب الايمان۔ مشكوة

وقال في تنقيح الرواة وله شاهد عند الحاكم، فى المستدرک عن أنس باسناد حسن وعند ابى داود واحمد والحاكم عن ابن عمر، وعند الديلمى عن معاذ، وتعدد الطرق يشد بعضها بعضا، ثم قال صدق الله وصدق رسوله صلى الله عليه وسلم، كل ما هو فى الحديث رأيناه في زماننا هذا وإلى الله المشتكى ١هـ۔ ص٥٨

١٠۔ قال: ”أوصيكم بتقوى الله، والسّمع، والطاعة، وإن عبدٌ حبشيٌ فإنّه من يعش منكم يرى اختلافاً كثيرا، وإيّاكم ومحدثات الأمور فإنّها ضلالة، فمن أدرک ذلک منكم فعليه بسنّتي وسنّة الخلفاء الراشدين المهديين، عضّو عليها بالنّواجذ“۔ قال الترمذي حسن صحيح ورواه ايضا ابن حبان في صحيحه والحاكم وقال صحيح على شرطها وليس له علة ورجال احمد رجال الحسن اهـ۔ تنقيح الرواة، ج١، ص٤٠۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”لوگوں پر ایسا زمانہ آنے والا ہے جب اسلام کا صرف نام رہ جائے گا، مساجد اچھی طرح تعمیر ہوئی ہوں گی مگر یہ ہدایت کے لحاظ سے خراب ہوں گی، اس وقت کے علماء آسمان کے نیچے بدترین لوگ ہوں گے، انہی کی طرف سے ہر فتنہ کی تعریف ہو گی“۔

اس حدیث میں تصریح ہے کہ ایک زمانہ میں علماء کی حالت عام طور پر خراب ہو گی اور اس سے مراد اکثر علماء ہیں کیونکہ ہر زمانہ میں ایک طائفہ کا حق پر ہونا دوسری حدیث سے ثابت ہے؛ اور ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اکثر علماء کا کسی مسئلہ میں ایک طرف ہونا اس کے حق پر ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

”میں تمہیں اللہ کے تقویٰ اور سمع وطاعت کی وصیت کرتا ہوں اگر چہ تمہارے اوپر حبشی غلام امیر بنایا جائے، تم میں سے جو زندہ رہے گا وہ بڑا اختلاف دیکھے گا، پس تم دین میں نئی باتیں پیدا کرنے سے بچو کہ (یہ) گمراہی ہے، پس تم میں سے جس نے یہ دور پالایا تو اُسے میری اور خلفائے راشدین کی سنت کو دانتوں سے پکڑنا چاہیے“۔

اس حدیث میں تصریح ہے کہ جب امت میں اختلاف پیدا ہو تو سنت نبوی اور سنتِ خلفاء الراشدین کا اتباع

وفيه ايضا قال بعض العلماء ء هم الخلفاء الاربعة يقوله صلى الله عليه وسلم الخلافة بعدي ثلاثون سنة ١ هـ۔

١١۔ عن معاذ، أنّ رسول الله صلى الله عليه وسلم حين بعثه إلى اليمن، فقال: "كيف تصنع إن عرض لک قضاءُ؟" قال: أقضي بما في كتاب الله، قال: "فإن لم يكن في كتاب الله؟" قال: فبسنّة رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: "فإن لم يكن في سنّة رسول الله صلى الله عليه وسلم؟"، قال: أجتهد رأيي لا آلو، قال: فضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم صدري، ثمّ قال: "الحمدلله الذي وفّق رسولَ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم لما يرضي رسول الله صلى الله عليه وسلم"۔ رواه سنن أبي داود في كتاب الأقضية، باب اجتهاد الرأي فى القضاء، ورواه الترمذي وغيرهما مثل هذا الحديث ايضا، ورجاله ثقات، الاحرث بن عمروا فى المغيرة بن شعبة مختلف فيه، ذكره ابن حبان فى الثقات وضعفه آخرون، كما يظهر من التهذيب ج٢، ص١٠٢۔ والحديث[9] منقطع ايضا، والانقطاع لا يضر عندنا۔

واجب ہے، کثرتِ جماعت و قلّتِ جماعت کا اعتبار ہر گز نہیں کیا جاوے گا۔ اگر ایک شخص متبع سنت ہو تو عالم دنیا کا اختلاف اس کو مضر نہ ہو گا۔ باقی جن احادیث کا حوالہ سوال میں دیا گیا ہے ان کا مطلب عن قریب واضح ہو جائے گا۔

معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مجھے یمن بھیجنا چاہا تو مجھ سے پوچھا ’اگر تمہیں قضا آجائے تو تم کس چیز سے اس کا فیصلہ کروگے؟‘ میں نے عرض کیا ”اللہ کی کتاب سے“ آپ ﷺ نے پوچھا ’اگر اللہ کی کتاب میں وہ نہ ہو؟“ میں نے عرض کیا ” رسول اللہ ﷺ کی سنت سے “ آپ ﷺ نے پوچھا ’اگر رسول اللہ ﷺ کی سنت میں نہ ہو تو؟“ میں نے عرض کیا ”اپنی رائے استعمال کروں گا“ آپ ﷺ نے میرا سینہ مارا اور فرمایا ’اللہ کے لیے تعریف ہے کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کے نمائندے کو اس چیز کی توفیق دی کہ جس سے اللہ کا رسول راضی ہوا“۔

اس حدیث میں تصریح ہے کہ اگر کوئی حکم کتاب اللہ و سنت رسول اللہ میں نہ ملے تو مشورہ کرنا واجب نہیں ہے بلکہ اپنے اجتہاد پر عمل کرنا ہر مجتہد کو جائز ہے۔

---

[9] قلت يويده ما في فتح الباري وعمر هو الذي كتب إلى شريح النظر ما تبين لک من كتاب الله، فلا تسئل عنه احدا فان لم تبين لک من كتاب الله فاتبع فيه سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم وما لم تبين لک من السنة فاجتهد فيه رأيک

اگر اس صورت میں مشورہ کرنا واجب ہوتا جیسا کہ حدیث نمبر ا مندرجہ سوال سے معلوم ہوتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ضرور حکم فرماتے کہ اپنے رفقا ابو موسیٰ اشعری، علاء بن حضرمی و علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہم [10] سے ان امور میں مشورہ کر کے فیصلہ کیا کریں مگر آپ نے ایسا نہیں فرمایا۔ پس ہر عالم کو، جب مسئلہ کتاب و سنت میں مصرح نہ ہو تو اپنے اجتہاد پر عمل کرنا اس حدیث سے جائز ہوا گو دوسرے علماء اس کے خلاف ہوں۔

١٢۔ روى العسكرى عن سليم بن العامرى، قال: ″سأل ابن الكواء عليّا عن السنّة والبدعة، وعن الجماعة والفرقة، فقال:يا ابن الكواء! حفظت المسئلة فافهم الجواب: السنّة والله سنّة محمد صلى الله عليه وسلم، والبدعة ما فارقها، والجماعة والله مجامعة أهل الحق، وإن قلوا، والفرقة مجامعة أهل الباطل، وإن كثروا“۔ (العسكري)۔ كذا في منتخب العمال ج١، ص١٠٩[11]

ابن عامری سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ سے ابن الکوا نے سنت و بدعت اور جماعت اور تفریق (فُرقہ) کے متعلق پوچھا، علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یا ابن الکوا! اس مسئلے کو سمجھو اور یاد رکھو، پھر فرمایا ’سنت رسول اللہ ﷺ کا عمل مبارک ہے اور بدعت وہ ہے جو اس سے ہٹا ہوا ہو، اور الجماعۃ اہل حق کا ساتھ ہے، اگرچہ وہ قلیل ہی کیوں نہ ہوں، اور فُرقہ

واخرج ابن ابى شيبة بسند صحيح، عن ابن مسعود نحو حديث عمر من رواية الشيبانى وقال في آخر فان جاءه ما ليس في ذالک فاجتهد رأيه فان الحلال بيّن والحرام بيّن فدع ما يريبک إلى ما يريبک اھ ملخصا ج١٣، ص٢٤٤، والله اعلم

[10] یمن میں یہ حضرات بھی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور بعض ان کے پیچھے پیچھے کچھ ایام کے فاصلے سے بھیجے گئے تھے۔ واللہ اعلم

[11] كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال، كتاب الإيمان والإسلام من قسم الأفعال، الباب الثاني: فى الاعتصام بالكتاب والسنة۔ تحت الرقم: ١٦٤٤

قال الذهبي فى الميزان عبد الله بن الكواء من رؤوس الخوارج اهـ۔ وفي لسان الميزان انه قد رجع عن مذهب الخوارج وعاود صحبته علي[12] وباقى رواته لم اعرف وعلى تراجمهم لم أقف وانما ذكرت[13] الحديث متابعة وقال الحافظ فى الفتح تحت حديث ابن عباس في قصّة وفاة النبى صلى الله عليه وسلم وخطبة ابى بكر من كان يعبد محمداً فإنّ محمدا قد مات الخ ما نصه، فيؤخذ منه أنّ الأقلّ عددا فى الاجتهاد قد يصيب ويخطئكثر فلا يتعيّن الترجيح بالأكثر، ولا سيّما إن ظهر أنّ بعضهم قلّد بعضا[14]۔ ج۸، ص۱۱۲

اہل باطل کا ساتھ دینا ہے اگر چہ وہ کثیر ہی کیوں نہ ہوں"۔

اس حدیث میں صاف تصریح ہے کہ اہل حق گو قلیل ہوں، ان کے ساتھ رہنا جماعت کے ساتھ رہنا ہے اور اہل باطل خواہ کثیر ہوں، ان کے ساتھ رہنا جماعت سے فرقت ہے۔ پس کسی مسئلہ میں جس کی دلیل کتاب وسنت واقوال فقہا سے زیادہ قریب ہو گی، وہ حق پر ہو گا، خواہ وہ شخصِ واحد ہی ہو۔ اور جو لوگ دلائل سے فیصلہ نہ کر سکیں، وہ یہ دیکھیں کہ تقویٰ اور علم ومحبت دین وخوف ودیانت ورجحانِ عقل میں کون زیادہ ہے۔ پس جو شخص ان کے اعتقاد میں ان اوصاف میں دوسروں سے ممتاز ہو، اس کا اتباع کریں کیونکہ ایسا شخص سنت نبویہ کا زیادہ متبع ہو گا۔

---

[12] [عبدالله بن الكواء من رؤوس الخوارج انتهى، وقال البخاري لم يصح حديثه قلت وله أخبار كثيرة مع علي وكان يلزمه ويعييه فى الأسئلة وقد رجع عن مذهب الخوارج وعاود صحبة علي، (لسان الميزان لإبن حجر: تحت الرقم: ١٣٦٤، الناشر: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات ـ بيروت، الطبعة الثالثة، ١٤٠٦ـ ١٩٨٦، تحقيق: دائرة المعرف النظامية۔ الهند]

[13] قلت وله شاهد صحيح من قوله صلى الله عليه وسلم، لا يزال طائفة من أمتي على الحق منصورين الخ، فالجماعة والله مجامعتهم وان قلو، والحديث يدل بعبارته على قلتهم فافهم ١٢ منه

[14] (فتح الباري، المغازي، تحت الرقم: ٤٠٩٤)

قال فى العالمكيرية: ۔وإذا كان المبتلى فقيهاً له رأيٌ فاستفتى فقيهاً آخر فأفتاه بخلاف رأيه يعمل برأي نفسه، وإذا كان المبتلى جاهلاً فإنّه يأخذ بفتوى أفضل الرجال عند عامّة الفقهاء۔ ج۴، ص۱۸۴ (كتاب أدب القاضي، الباب الثامن عشر فى القضاء بخلاف ما يعتقده المحكوم له أو المحكوم عليه وفيه بعض مسائل الفتوى)

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ جب انسان خود فقیہ ہو تو مسئلۂ نازلہ میں اس کو اپنی رائے پر عمل کرنا واجب ہے۔ دوسرے فقہا کی رائے اگر اس کے خلاف ہو، اس پر اس کو عمل جائز نہیں (گو وہ شمار میں کتنے ہی ہوں یدل علیه إطلاق الجواب)

۲۔ عام لوگوں کو مسئلۂ نازلہ میں اس شخص کے فتوے پر عمل کرنا واجب ہے جو ان کے اعتقاد میں سب سے افضل ہو۔ اس میں یہ حکم نہیں بتلایا گیا کہ جدھر زیادہ ہوں ادھر جانا چاہیے بلکہ صاف تصریح ہے کہ عالمِ افضل کے فتوے پر عمل کرنا چاہیے جو ان کے اعتقاد میں سب سے افضل ہو۔

۱۳۔ وفى المنار ونور الانوار في تعريف الاجماع هو اتفاق مجتهدين من امة محمد صلى الله عليه وسلم فى عصر واحد امر قولي او فعلي وخلاف الواحد مانع كخلاف الأكثر اهـ

وقال في كشاف اصطلاحات الفنون واحترز بلفظ المجتهدين بلام الاستغراق عن اتفاق بعضهم وعن اتفاق غيرهم من العوام والمقلدين فان موافقتهم ومخالفتهم لا يعبأها، اهـ۔ ج۳، ص۲۳۸۔

نورالأنوار کی عبارت میں اس کی تصریح ہے کہ خلاف واحد بھی اسی طرح مانع انعقاد اجماع ہے جس طرح خلاف اکثر۔ اس سے معلوم ہوا کہ مخالفتِ جمہور کی صورت میں شخصِ واحد کا قول بھی اسی طرح محتملِ صواب ہے جس طرح قولِ جمہور کی مخالفت ناجائز ہوتی ہے۔ اور اختلاف کے وقت مشورہ کرنا مسائلِ شرعیہ میں واجب ہوتا ہے۔ اور جمہور کے خلاف قول ہمیشہ باطل ہوا کرتا تو خلافِ واحد ہرگز قادح اجماع نہ ہوتا بلکہ اس کو موافقتِ جمہور پر مجبور کیا جاتا، حالاں کہ یہ کسی کا مذہب نہیں ہے۔

پس معلوم ہوا کہ جمہور سے خلاف شخصِ واحد کا قول صحیح ہو سکتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آج کل کے علماء اگر کسی مسئلۂ شرعیہ میں اتفاق کرلیں تو اس کو اجماعِ شرعی نہ کہیں گے کیونکہ وہ مقلدین کا اجماع ہوگا جو کہ غیر معتبر ہے۔

پس چار سو یا تین سو علماء کے اتفاق کو اجماع کہنا تو کسی طرح بھی درست نہ ہو گا جبکہ ان کے خلاف بھی علماء کی ایک جماعت موجود ہے، گو وہ ان کے زعم میں قلیل ہی ہوں۔

فإن قلت: قال البيرى تحت قاعدة الأصل الحقيقة ما نصه متى اختلف فى المسئلة فالعبرة بما قوله الاكثر۔ فتاوى حامدية ج۴ قلت هذا متعلق بباب النقل دون الفهم والاستنباط والعمل بقول الأكثر في باب النقل متعين فان الخبر المشهور مقدم على الآحاد والمتواتر مقدم على كليهما ودليل هذا التقيد ما ذكره في هذه الفتاوى۔ ج۲، ص۳۲۴

بما نصه وما نقله الشرنبلالي عن العيني في استنباط الأحكام من جواز لبس الأحمر من الحديث الشريف فذاک من حيث الاستنباط لا من حيث نقل المذهب وإلّا فناقل الكراهة كثيرٌ بل اكثر، والقياس أن يعمل بما عليه الأكثر[15] الى ان قال۔ على أنّ الذي يجب على المقلّد اتباع مذهب إمامه۔ والظاهر أنّ ما نقله هؤلاء الأئمّة هو مذهب الإمام[16] اهـ، ولا يخفى ان إختلاف علماء ء زماننا في مسئلة ليس من باب النقل عن الإمام بل إنما هو من باب الإختلاف فى الفهم ولا عبرة فيه للكثرة۔

یہ گفتگو تو صورتِ اولی کی قسم اول میں تھی؛ رہی دوسری قسم، یعنی جبکہ مسائل شرعیہ اعتقادیہ میں اختلاف ہو تو اس صورت میں اکثر کا اتباع کرنا چاہیے، یعنی خیر القرون میں جس طرف زیادہ علماء ہوں اس کا اتباع واجب ہے کیونکہ اعتقادیات زمانۂ خیر القرون میں مکمل ہو چکے ہیں۔ نیز اس وقت عام طور پر خیر اور حق کا غلبہ تھا، اس زمانہ میں اعتقادیات میں جس طرف زیادہ جماعت ہوتی تھی اس طرف غلبہ خیر کا ہوتا تھا اور اعتقادیات کا مدار محض نقل و سماع پر ہے، اجتہاد سے اعتقادیات کا ثبوت نہیں ہو سکتا اور علوم نقلیہ کی تکمیل خیر القرون میں ہو چکی ہے، اب اعتقادیات میں کسی مسئلہ کا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ خیر القرون کے بعد اعتقادیات میں بھی کثرتِ قائلین کا اعتبار نہیں کیونکہ ان میں غلبۂ خیر نہیں رہا اور چونکہ اعتقادیات کی تکمیل زمانۂ صحابہ و تابعین میں ہو چکی ہے اس لیے ان کے خلاف جو قول ہو گا وہ مردود ہو گا، گو قائلین کتنے ہی زیادہ ہوں۔

---

[15] (تنقيح الفتاوى الحامدية ـ كتاب الفرائض ـ مسائل وفوائد شتّى من الحظر والإباحة وغير ذالک)

[16] ايضا

فی المرقات: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اتبعوا السواد الأعظم يعبر به عن الجماعة الكثيرة والمراد ما عليه أكثر المسلمين قيل وهذا في أصول الإعتقاد كأركان الإسلام وأما الفروع كبطلان الوضوء بالمس مثلا فلا حاجة فيه إلى الإجماع بل يجوز اتباع كل واحد من المجتهدين كالأئمة الأربعة[17]۔ ج۱، ص۲۰۵۔

مرقات میں ہے کہ ”آپ ﷺ نے جب فرمایا کہ سواد اعظم کی اتباع کرو، تو اس سے مراد یہ ہے عقائد کے اصولوں میں بڑی جماعت کی اتباع کرو، یعنی جس پر مسلمانوں کی اکثریت متفق ہو، جیسے اسلام کے ارکان وغیرہ کے معاملہ میں، جہاں تک فروع والے مسائل ہیں، جیسے کہ وضو کے ٹوٹنے کے مسائل تو ان میں ان میں اکثریت کی نہیں، بلکہ کسی مجتہد امام کی پیروی ہو سکتی ہے“۔

اس عبارت سے پہلے جواب کی بھی تائید ہوگئی کہ مسائل فرعیہ میں اکثر کا اتباع ضروری نہیں بلکہ کسی ایک مجتہد کا اتباع بھی جائز ہے۔ گو اس کا قول اکثر کے خلاف ہو، فافہم!

رہی شق ثانی، یعنی جبکہ امور انتظامیہ میں اختلاف ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا کوئی امام ہو اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس کی اطاعت کر چکی ہو تو امام کا اتباع اور اس جماعت کی موافقت واجب ہے، ان سے امورِ انتظامیہ میں الگ ہونا اور اس کی مخالفت کرنا جائز نہیں۔ البتہ اگر وہ احکامِ شرعیہ کی خلاف ورزی کریں تو ایسے کاموں میں ان کی موافقت نہ کی جاوے كأنه لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق بلکہ خیر خواہی کے ساتھ ایسے امور میں بقدر استطاعت ان کی مخالفت کی جاوے۔ لیکن اس طور پر ان کی مخالفت نہ کی جاوے کہ امام کا مقابلہ کر کے مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ منتشر کیا جاوے۔ ہاں! اگر امام اور اس کی جماعت سے کفرِ صریح کا صدور ہو تو پھر اس کا مقابلہ کرنا اور اس کی جمعیت کو منتشر کرنا بھی جائز ہے، بلکہ بقدر استطاعت واجب ہے۔ اور اگر مسلمانوں کا کوئی امام نہ ہو تو فقہاء و عابدین و مسلمین صالحین کے مشورہ سے کسی کا امام مقرر کرنا واجب ہے۔ اس صورت میں رائے خاصہ پر عمل جائز نہیں ہے بلکہ جماعت علماء صالحین و جمہور مسلمین جس شخص پر اتفاق کریں اسی کو امام بنانا واجب ہے۔ کیونکہ امامت

---

[17] مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - باب الإعتصام بالكتاب والسنة

اشراف واعیان وجماعت مسلمین کی بیعت کر لینے سے ثابت ہوتی ہے۔ ایک دو شخص کی بیعت سے کوئی امام نہیں بن سکتا لہٰذا اس معاملہ میں اہل حل وعقد کی جماعت کے اکثر افراد کا اتفاق معتبر ہے، شخصِ واحد کی رائے معتبر نہیں۔ بلکہ شخصِ واحد کو جماعت سے اختلاف کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر جماعت، علماء وجمہور مسلمین کسی شخصِ واحد کی رائے پر اس معاملہ کو چھوڑ دیں تو اس صورت میں رائے خاصہ پر عمل جائز ہوگا کیونکہ وہ شخص جماعت مسلمین کا وکیل ہے، اس کی رائے گویا سب کی رائے ہوگی۔ اسی طرح اگر خلیفہ سابق اپنے بعد کے لیے کسی خاص شخص کو خلیفہ بنا جاوے تو اس صورت میں بھی اس کی رائے کا اتباع جائز بلکہ ضروری ہے۔ بشرط یہ کہ جس کو نامزد کیا گیا ہے، نا اہل نہ ہو۔ پس اگر مشورہ وغیرہ سے کسی ایک امام پر اتفاق ہو گیا تب تو اس کے احکام وہی ہیں جو شق اول کے احکام ہیں کہ پھر امام اور جماعت مسلمین کی مخالفت امورِ انتظامیہ میں کسی کو جائز نہیں بتفصيله الذي ذكرناه آنفاً، اور اگر مشورہ سے کسی ایک امام پر اتفاق نہ ہوا بلکہ اختلاف پیدا ہو گیا تو ان سب جماعتوں سے الگ ہو جانا چاہیے، اس صورت میں کسی جماعت کا اتباع واجب نہیں، عزلت بہتر ہے۔

عن النّبى صلى الله عليه وسلم، قال: ”من رأى من أميره شيئاً يكرهه فليصبر عليه، فإنّه من فارق الجماعة شبرا فمات إلّا مات ميتة جاهلية“۔ رواه البخاري (كتاب الفتن، باب قول النبى صلى الله عليه وسلم سترون بعدي أموراً تنكرونها) فتح الباري ج١٣، ص٥

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے جو اپنے امیر کی کوئی ناگوار چیز دیکھے تو صبر کرے پس جس نے بالشت برابر بھی جماعت سے علیحدگی اختیار کی تو وہ جہالت کی موت مرا۔

وفى الفتح قال ابن بطّال: فى الحديث حجّة في ترک الخروج على السلطان ولو جار، وقد أجمع الفقهاء على وجوب طاعة السلطان المتغلّب والجهاد معه وأنّ طاعته خير من الخروج عليه لما في ذلک من حقن الدماء وتسكين الدّهماء، وحجّتهم هذا الخبر وغيره ممّا يساعده، ولم يستثنوا من ذلک إلّا إذا وقع من السلطان الكفر الصريح فلا تجوز طاعته

اور فتح الباری میں ہے کہ، ابن بطال نے فرمایا یہ حدیث حاکم کے خلاف خروج نہ کرنے پر دلالت کرتی ہے اگرچہ وہ گناہ کا مرتکب بھی ہو۔ اور فقہا کا اس بات پر اجماع ہے کہ متغلب سلطان (یعنی حاکم) کی اطاعت کی جائے اور اس کے ساتھ مل کر جہاد کیا جائے کیونکہ اس میں خون کی عصمت اور انتشار سے بچاؤ ہے۔ اور ان کی دلیل یہ مذکورہ حدیث اور اس کی تائید کرنے

في ذلک بل تجب مجاهدته لمن قدر عليها كما فى الحديث الذي بعده۔ ج۱۳، ص۵ (فتح الباري، كتاب الفتن باب قول النبى صلى الله عليه وسلم سترون بعدي أمورا تنكرونها)

وعن عبادة بن الصامت قال دعانا النبى صلى الله عليه وسلم فبايعناه فقال فيما اخذ علينا ان بايعنا على السمع والطاعة (إلى ان قال) وان لا ننازع الأمر اهله الا ان تروا كفراً بواحاً عندكم من الله فيه برهان اھ مختصرا رواه البخاري

[عن جُناده بن أبي أميّة، قال: ”دخلنا على عبادة بن الصامت وهو مريض، قلنا: أصلحک الله، حدّث بحديث ينفعک الله به سمعته من النبى صلى الله عليه وسلم، قال: دعانا النبى صلى الله عليه وسلم، فبايعناه، فقال فيما أخذ علينا: أن بايعنا على السمع والطاعة فى منشطنا ومكرهنا، وعسرنا ويسرنا، وأثرة علينا، وأن لا ننازع الأمر أهله إلّا أن ترو كفرا بواحاً عندكم من الله فيه برهان، صحيح البخاري، كتاب الفتن، باب قول النبى صلى

والی دیگر احادیث ہیں۔ فقہاء نے اس (اصول) سے کسی کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا الّا یہ کہ حاکم کفر صریح کا مرتکب ہو[۱۸]۔ اگر یہ صورت ہو تو اس کی اطاعت جائز نہیں بلکہ اس کے خلاف جہاد واجب ہے جیسا کہ بعد والی احادیث میں ہے۔

حضرت عبادہ ابن صامت سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے سمع و طاعت پر بیعت لی اور اس بیعت میں یہ بات بھی تھی کہ ہم حکم کے بارے میں اس کے اہل سے تنازع نہیں کریں گے الّا یہ کہ ہم کفر بواح دیکھیں جس کے بارے میں ہمارے پاس اللہ کی طرف سے واضح دلیل ہو۔

جنادہ بن ابی امیہ روایت کرتے ہیں، انہوں نے بیان کیا کہ ہم لوگ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، وہ بیمار تھے، ہم لوگوں نے کہا: اللہ آپ کی اصلاح کرے آپ کوئی حدیث بیان کریں جو آپ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنی ہو تا کہ اللہ آپ کو اس کا نفع پہنچائے، انہوں نے کہا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم لوگوں کو بلایا اور ہم نے آپ کی بیعت کی، آپ نے جن باتوں کی ہم سے بیعت لی وہ یہ تھیں کہ ہم بیعت کرتے ہیں اس بات پر ہم اپنی خوشی اور

---

[۱۸] کفرِ بواح کی مثالوں میں شریعت کی جگہ خلافِ شریعت نظامِ حکومت کا نفاذ، نفاذِ شریعت کا مطالبہ کرنے والوں کے خلاف جنگ، ان کو شہید و قتل کرنا اور انہیں جیلوں میں ڈالنا بھی شامل ہے۔ (ادارہ)

الله عليه وسلم سترون بعدي أمورا تنكرونها] كذا فى الفتح ج١٣، ص٦

وفى الفتح عن عبادة مرفوعاً "سيكون عليكم أمراء يأمرونكم بما لا تعرفون ويفعلون ما تنكرون فليس لأولئک عليكم طاعة"۔ اھ

قال الحافظ والذي يظهر حمل رواية الكفر على ما إذا كانت المنازعة فى الولاية فلا ينازعه بما يقدح فى الولاية إلّا إذا ارتكب الكفر، وحمل رواية المعصية على ما إذا كانت المنازعة فيما عدا الولاية، فإذا لم يقدح فى الولاية نازعه فى المعصية بأن ينكر عليه برفق ويتوصّل إلى تثبيت الحق له بغير عنف، ومحلّ ذلک إذا كان قادرا والله أعلم۔ ونقل ابن التين عن الداودي قال: الذي عليه العلماء في أمراء الجور أنّه إن قدر على خلعه بغير فتنة ولا ظلم وجب، وإلّا فالواجب الصبر۔ وعن بعضهم لا يجوز عقد الولاية لفاسق ابتداء، فإن أحدث جورا بعد أن كان عدلا فاختلفوا في جواز الخروج عليه، والصحيح المنع إلّا أن يكفّر فيجب الخروج عليه۔ اھ ج١٣، ص٦، (فتح الباري، كتاب الفتن، باب قول النبى صلى الله عليه وسلم سترون بعدي أمورا تنكرونها)

اپنے غم میں اور تنگ دستی اور خوش حالی اور اپنے اوپر ترجیح دیے جانے کی صورت میں سنیں گے اور اطاعت کریں گے اور حکومت کے لیے حاکموں سے نزاع نہیں کریں گے لیکن اعلانیہ کفر پر، جس پر اللہ کی طرف سے دلیل ہو۔

اور فتح الباری میں عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: عن قریب تم پر ایسے حکمران ہوں گے جو تمہیں ایسے احکامات دیں گے جنہیں تم (دین میں) نہیں جانتے اور ایسے کام کریں گے جن کا تم انکار کرتے ہو (یعنی دین کے خلاف کریں گے) پس تم پر ان کی کوئی اطاعت واجب نہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کفر والی روایات کو حاکمیت پر محمول کرنا ہی ظاہر ہوتا ہے۔ پس حاکمیت کے بارے میں تنازع اس وقت تک نہیں کیا جائے گا جب تک حاکم کفر بواح کا ارتکاب نہ کرے۔ اور معصیت والی روایت کو حاکمیت سے کم درجے کی چیزوں پر محمول کیا جائے گا۔ پس اگر جرح نہ کی جائے تو اس کے گناہ پر اختلاف کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے کام پر نرمی سے انکار کیا جائے اور بغیر سختی کے اس پر حق کو واضح کیا جائے۔ اور اس جرح کا مقام تب ہے جب وہ اس پر قادر ہو۔ واللہ اعلم۔

اور ابن التین نے الداودی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس بات پر فقہا کا اتفاق ہے کہ اگر ظالم حاکم کو بغیر فتنے

اور ظلم کہ ہٹانے کی طاقت ہو تو اسے ہٹانا واجب ہے اور اس کی قدرت نہ ہونے کی صورت میں اس پر صبر کرنا واجب ہے۔ اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ فاسق کو ابتداءً حاکم بنانا ہی جائز نہیں۔ اور اگر وہ عادل تھا اور حاکم بننے کے بعد اس نے گناہ کیا تو اس پر خروج میں اختلاف ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ اس پر خروج نہ کیا جائے الّا یہ کہ کفر کرے تو اس صورت میں خروج واجب ہے۔

وعن حذيفة في حديث طويل قلت: فهل بعد ذلک الخير من شر؟ قال: نعم، دعاةٌ على أبواب جهنم من أجابهم إليها قذفوه فيها، قلت: يا رسول الله، صفهم لنا، قال: هم من جلدتنا، ويتكلمون بألسنتنا، قلت: فما تأمرني إن أدركني ذلک، قال: تلزم جماعة المسلمين وإمامهم، قلت: فإن لم يكن لهم جماعة ولا إمام؟ قال: فاعتزل تلک الفرق كلها، ولو أن تعض بأصل شجرة حتى يدرکک الموت وأنت على ذلک۔ رواه البخاري (كتاب الفتن، باب كيف الأمر إذا لم تكن جماعة) وفى الفتح قال الطبري: أختلف في هذا الأمر وفى الجماعة، فقال قوم: هو للوجوب والجماعة السواد الأعظم، ثم ساق عن محمد بن سيرين عن ابى مسعود أنّه وصّى من سأله لمّا قتل عثمان ”عليک بالجماعة فإنّ الله لم يكن ليجمع أمة محمد على ضلالة“، وقال قوم: المراد بالجماعة الصحابة دون من بعدهم، وقال

اور حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت ہے کہ میں نے پوچھا: کیا اس خیر کے بعد بھی کوئی شر ہے؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: ہاں جہنم کے دروازوں پر کھڑے داعی؛ جو ان کی پکار پر جواب دے گا وہ اسے جہنم میں دھکیل دیں گے۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمیں ان کی صفات بتائیں، تو آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا: وہ ہمارے ہی رنگ والے ہوں گے، ہماری ہی زبان بولتے ہوں گے۔ میں نے کہا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و سلم اگر میں اس وقت کو پاؤں تو آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا: تم مسلمانوں کی جماعت اور امام کو لازم پکڑو۔ تو میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اگر ان کی نہ جماعت ہو اور نہ ہی امام؟ تو آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا: پس پھر ان سب فرقوں سے الگ ہو جاؤ اگرچہ تمہیں

قوم: المراد بهم أهل العلم لأنّ الله جعلهم حجّة على الخلق والنّاس تبع لهم في أمر الدّين۔ قال الطبرى: والّصواب أنّ المراد من الخبر لزوم الجماعة الذين في طاعة من اجتمعوا على تأميره، فمن نكث بيعته خرج عن الجماعة، قال: وفى الحديث أنه متى لم يكن للناس إمام فافترق الناس أحزابا فلا يتبع أحدا فى الفرقة ويعتزل الجميع إن استطاع ذلک خشية من الوقوع فى الشّر، اھ ج١٣، ص٣١۔ (فتح الباري، كتاب الفتن، باب كيف الأمر إذا لم تكن جماعة)

درختوں کی جڑیں ہی چبانی پڑیں اور تمہیں اسی حالت موت آجائے۔

اور فتح الباری میں ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس امر اور جماعت سے مراد میں اختلاف ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ امر وجوب کے لیے ہے اور جماعت سے مراد سوادِ اعظم ہے۔

پھر ابن سیرین نے ابو مسعود کی وصیت نقل کی ہے جو انہوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت ایک سائل کو کی تھی، آپ نے فرمایا: تم جماعت کو لازم پکڑو کیونکہ اللہ تعالیٰ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔ اور بعض علماء کا کہنا ہے کہ جماعت سے مراد جماعت صحابہ ہیں نہ کہ دوسرے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد اہل علم ہیں کیونکہ اللہ نے انہیں مخلوق پر حجت بنایا ہے اور لوگ دین میں ان کی اتباع کرنے والے ہیں۔ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث میں لزوم جماعت جس کی اتباع لازم ہے وہ جماعت ہے جو کسی کی امارت پر جمع ہو چکی ہے۔ پس جس نے بیعت توڑی تو وہ جماعت سے خارج ہو گیا۔

فرماتے ہیں: اور حدیث میں ہے کہ جب لوگوں کا کوئی امیر نہ ہو اور لوگ گروہوں میں بٹ جائیں تو ان میں سے کسی کی بھی اتباع نہیں کی جائے گی، اور اگر

وأخرجه الطبری وصححه ابن حبان من طریق العلاء بن عبد الرحمٰن بن یعقوب عن أبی هریرة قال: "قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: کیف بک یا عبد الله بن عمرو إذا بقیت في حثالة من الناس قد مرجت عهودهم وأماناتهم واختلفوا فصاروا هکذا، وشبّک بین أصابعه۔ قال: فما تأمرني؟ قال: علیک بخاصّتک، ودع عنک عوامهم[19]۔ ج١٣، ص٣٢

استطاعت ہو تو وہ شر کے ڈر سے سب سے الگ ہو جائے گا۔

اور طبری رحمہ اللہ نے ایک روایت نقل کی ہے جسے ابن حبان نے صحیح کہا ہے، وہ علاء بن عبد الرحمن بن یعقوب سے، وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبد اللہ بن عمرو! تیرا اس وقت کیا حال ہو گا جب ایسے لوگ بچ جائیں گے جو عہد و امان کو پامال کر چکے ہوں گے اور انہوں نے اختلاف کیا یہاں تک کہ وہ ایسے ہو گئے؟...... نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالا...... تو انہوں نے کہا آپ اس وقت مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تم اپنے خواص کو لازم پکڑو اور ان کے عوام کو چھوڑ دو۔

اس اختتامِ گفتگو کے بعد ان احادیث کا مطلب سمجھنا چاہیے جو سائل نے بیان کی ہیں۔ حدیثِ اول جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت اور مجمع الزوائد میں مذکور ہے، وہ ہمارے نزدیک ان مسائل شرعیہ پر، جن کا حکم کتاب و سنت یا اجماعِ امت یا قیاس سے معلوم ہو چکا ہے، محمول نہیں، بلکہ امورِ انتظامیہ اور امور مسکوت عنها في الشرع سے متعلق ہے۔ پس مسائل حاضرہ میں اس حدیث سے استدلال کر کے مشورہ کو واجب کہنا اور جماعتِ کثیرہ کے مشورہ پر عمل کو لازم کہنا اس پر موقوف ہے کہ اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ شریعت میں مسائل حاضرہ کے احکام موجود نہیں، اس لیے ان میں مشورہ کی ضرورت ہے اور اس کو ہرگز کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ ہر فریق اپنے مسلک کو

---

[19] فتح الباري، کتاب الفتن، باب إذا بقی في حثالة من النّاس

دلائل شرعیہ سے ثابت کر رہا ہے۔ یا یہ مان لیا جاوے کہ مسائل حاضرہ کا تعلق محض امورِ انتظامیہ سے ہے، مسائل شرعیہ کی قسم سے نہیں ہے، مگر سائل اس کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اگر اس کو تسلیم کر لیا جاوے تو پھر ان علماء کی غلطی یقیناً تسلیم کرنا پڑے گی جو ان تحریکات سے علیحدہ رہنے والی جماعت کو فاسق وغیرہ کا خطاب دیتے ہیں، کیونکہ امور انتظامیہ جو محلِ مشورہ ہیں ان میں مشورہ پر عمل کرنا اس وقت واجب ہے جبکہ مسلمانوں کا کوئی امام مسلم ہو اور مشورے سے امام ہی کی بات کی تائید ہوتی ہو، اور اگر امام نہ ہو تو امور انتظامیہ میں بھی کسی کے مشورہ پر عمل کرنا واجب نہیں کیونکہ وجوب و فرضیت کا ثبوت دلائل شرعیہ سے ہی ہو سکتا ہے اور دلائل شرعیہ کتاب و سنت، اجماعِ امت و قیاس میں منحصر ہیں، مشورے کو کسی نے دلائل شرعیہ سے بیان نہیں کیا جس سے وجوب عمل کو ثابت کیا جاوے۔ وسیأتی ذلک مفصلا۔

پس حدیث مجمع الزوائد کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت کسی کو خلیفہ یا امام بنایا جاوے یا امورِ حرب در پیش ہوں یا کسی امر میں نصوص سے جانبِ فعل یا ترک کو ترجیح نہ ہو، اس میں فقہا و عابدین سے مشورہ کیا جائے، کسی شخصِ واحد کی رائے اس میں نافذ نہ کی جائے، اور اس پر چند قرائن ہیں:

اول تو خود اس میں لفظ تشاور اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ حکم ایسے امر کے متعلق ہے جو محلِ مشورہ ہے اور محلِ مشورہ مسائل شرعیہ نہیں۔ اور ایسے امور محلِ مشورہ کیوں کر ہو سکتے ہیں جبکہ نص صریح موجود ہے؟ اَلۡيَوۡمَ أَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِينَكُمۡ۔ مَّا فَرَّطۡنَا فِي الۡكِتَابِ مِن شَيۡءٍ، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے دین کے متعلق کوئی بات کتاب میں نہیں چھوڑی اور یہ ظاہر ہے کہ صراحتاً تمام جزئیات کے احکام قرآن میں نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ بعض احکام صراحتاً ہیں اور بعض دلالۃً و اشارۃً، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علماء و مجتہدین نے سمجھا اور فقہ میں بیان کیا، جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے: لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسۡتَنۡبِطُونَهُ مِنۡهُمۡ، جس میں علماء کو قیاس کی اجازت دی گئی ہے۔ الغرض مسائل شرعیہ کے احکام بأسرہا شریعت میں موجود ہیں، وہ ہرگز محتاجِ مشورہ نہیں ہیں۔ اور اگر کہیں مسائل شرعیہ میں مشورہ ثابت ہو تو وہ محض تطییب قلب یا استمداد کے طور پر تھا، ضرورت کے درجے میں نہ تھا بلکہ مثل مشورہ امور دنیوی ہیں یا امور انتظامیہ متعلق امامت و خلافت و جہاد وغیرہ بہ

شرط یہ کہ حکم شرعی اس سے متعلق دلائل شرعیہ سے معلوم نہ ہوا ہو یا وہ امور ہیں جن سے شریعت میں سکوت ہے۔ اور قیاس سے کسی جانب کو ترجیح معلوم نہیں ہوئی، نہ ترک کو اور نہ فعل کو۔ اگر معلوم ہو جائے تو پھر وہ بھی محل مشورہ نہیں۔

قال الحافظ فى الفتح وقد أختلف في متعلق المشاورة فقيل: في كلّ شيء ليس فيه نصّ وقيل فى الأمر الدنيوى فقط وقال الداودي: إنّما كان يشاوره في أمر الحرب ممّا ليس فيه حكم؛ لأنّ معرفة الحكم إنّما تلتمس منه قال: ومن زعم أنّه كان يشاوره فى الأحكام فقد غفل غفلة عظيمة وأمّا في غير الأحكام فربّما رأى غيره أو سمع ما لم يسمعه أو يره كما كان يستصحب الدّليل فى الطريق[20] اهـ ج١٣، ص٢٨٣

حافظ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں: مشورے کے متعلقات میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ہر اس چیز میں ہو گا جس میں نص نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ صرف دنیاوی امور میں ہو گا۔ اور داودی کہتے ہیں کہ وہ صرف جنگی امور میں مشورہ کرتے تھے جس کے بارے میں کوئی حکم موجود نہیں ہے، کیونکہ حکم کی معرفت اسی سے ہوتی ہے۔ مزید فرماتے ہیں: جس کا یہ زعم ہے کہ وہ احکام میں مشاورت کرتے تھے اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے اور رہا احکام کے علاوہ تو اس میں کبھی دوسرے سے ایسی بات سننے یا دیکھنے کو ملتی جو انہوں نے سنی یا دیکھی نہ ہوتی جیسا کہ دلائل سے واضح ہوتا ہے۔

وقال البخاري رحمه الله في صحيحه: وكانت الأئمة بعد النبى صلى الله عليه وسلم يستشيرون الأُمناء من أهل العلم فى الأمور المباحة ليأخذوا بأسهلها فإذا وضح الكتاب أو السنّة لم يتعدّوه إلى غيره اقتداء بالنبى صلى الله عليه وسلم ورأى أبوبكر قتال من منع

اور بخاری رحمہ اللہ اپنی صحیح میں فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ائمہ مباح امور میں امین لوگوں سے مشورہ کیا کرتے تھے تا کہ وہ آسان بات کو اختیار کریں۔ پس جب قرآن و سنت سے کوئی چیز واضح ہو جاتی تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرتے ہوئے

---

[20] فتح الباري، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة۔ باب قول الله تعالى: وأمرهم شورى بينهم، وشاورهم فى الأمر

الزكاة فقال عمر كيف تقاتل الناس وقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم أمرت أن أقاتل النّاس حتى يقولوا لا إله إلّا الله فإذا قالوا لا إله إلّا الله عصموا منّي دماءهم وأموالهم إلّا بحقّها وحسابهم على الله۔ فقال أبو بكر والله لأقاتلنّ من فرّق بين ما جمع رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم تابعه بعد عمر فلم يلتفت أبوبكر إلى مشورة إذ كان عنده حكم رسول الله صلى الله عليه وسلم فى الذين فرقوا بين الصلاة والزكاة وأرادوا تبديل الدين وأحكامه، وقال النبى صلى الله عليه وسلم من بدّل دينه فاقتلوه الخ[21] فتح الباري ج٣، ص٢٨٦۔

کسی اور کی طرف تجاوز نہ کرتے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات کے بعد کسی اور کی بات نہ لیتے)۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوۃ سے قتال کا ارادہ کیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم کیسے لوگوں سے لڑو گے حالاں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہیں اگر وہ یہ کہہ لیں تو وہ مجھ سے اپنے خون مال بچا لیں گے سوائے اس حق کے جو ان پر لازم ہے اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہو گا؟ تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: واللہ! میں ضرور اس سے لڑوں گا جو اس میں اختلاف کرے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے جمع کیا۔ پھر عمر رضی عنہ نے بھی ان کی اتباع کی۔ تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مشورے کی طرف اس وقت التفات نہیں کیا جب ان کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم نماز و زکوۃ میں فرق کرنے والے اور دین کو تبدیل کرنے والے کے بارے میں موجود تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنا دین تبدیل کیا اسے قتل کر دو۔

وقال الحافظ في شرح قوله فى الأمور المباحة ليأخذوا بأسهلها أي إذا لم يكن فيها نصّ بحكم معيّن وكانت على أصل الإباحة، فمراده ما احتمل الفعل والترک احتمالا واحدا، وأمّا

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس قول کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: مباح امور میں ضروری ہے کہ آسان کو ہی لیں۔ ایسا تب کریں گے جب اس میں کسی خاص حکم

---

[21] صحيح البخاري، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة۔ باب قول الله تعالى: وأمرهم شورى بينهم، وشاورهم فى الأمر

ما عرف وجه الحكم فيه فلا[22]، اھ ج١٣، ص٢٨٥

کی نص نہ ہو تو یہ اپنی اصل یعنی اباحت پر ہوں گے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی اس سے مراد وہ معاملہ ہے جس میں کام کے کرنے یا نہ کرنے کا ایک ہی احتمال ہو۔ اور اگر یہ صورت نہ ہو بلکہ حکم کا پتا چل جائے تو حکم کو ہی لیا جائے گا۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مسائل شرعیہ جب کہ ان کا حکم کتاب و سنت اجماع یا قیاس سے معلوم ہو چکا ہو محل مشورہ ہر گز نہیں۔ ہاں وہ امور جو بوجہِ سکوتِ شارع بظاہر اباحت اصلیہ پر ہوں اور ان میں فعل اور ترک دونوں کا احتمام مساوی ہو وہ محل مشورہ ہیں اور اگر ان میں بھی ایک جانب کا حکم دلیل شرعی سے معلوم ہو جائے تو پھر وہ بھی محل مشورہ نہیں۔ لہٰذا مجمع الزوائد کی حدیث سے یہ استدلال کرنا کہ جب علماء میں کسی مسئلہ شرعی میں اختلاف ہو تو اہل مشورہ اور جماعت کثیرہ کا قول واجب الاتباع ہے اور جماعت قلیلہ یا شخصِ واحد کا قول قابلِ ترک ہے، کسی طرح تام نہیں ہو سکتا۔ پھر ہم بطریق تنزل کہتے ہیں کہ اس حدیث کو عموم پر ہی رکھا جائے اور مسائل شرعیہ کو بھی محل مشورہ مان لیا جائے پھر بھی مستدل کو یہ ثابت کرنا لازم ہے کہ مشورہ کرنا اور مشورہ میں جس طرف کثرت رائے ہو تو اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ حالاں کہ وہ اس کو ہر گز ثابت نہیں کر سکتا۔ محققین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ مشورہ کا امر آیت قرآنیہ وَشَاوِرۡهُمۡ فِي الۡأَمۡرِ، وَأَمۡرُهُمۡ شُورَىٰ بَيۡنَهُمۡ میں استحباب اور ندب کے لیے ہے۔ پھر اس حدیث کو استحباب پر کیوں محمول نہ کیا جائے؟ رہی یہ بات کہ مشورہ میں جس طرح زیادہ جماعت ہو اس پر عمل کرنا واجب ہے، یہ بھی غلط ہے، بلکہ اگر کسی عالم کا اجتہاد سب کے خلاف ہو تو اس کو دوسروں کا اتباع جائز نہیں کیوں کہ مشورہ دلائل شرعیہ سے مثل اجماع و قیاس کے نہیں ہے بلکہ محض معین کے درجہ میں ہے۔

قال الحافظ فی الفتح وعدّ كثير من الشافعية المشاورة فی الخصائص واختلفوا في وجوبها فنقل البيهقي فی المعرفة الاستحباب عن

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں: شوافع کی اکثریت کے ہاں مشورہ خاص امور میں ہی ہو گا۔ پس بیہقی رحمہ اللہ نے المعرفۃ میں نص سے

---

[22] فتح الباري، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة۔ باب قول الله تعالىٰ: وأمرهم شورى بينهم، وشاورهم فی الأمر

النّص وبه جزم أبو نصر القُشيري في تفسيره وهو المرجّح[23]۔

استدلال کرتے ہوئے اسے مستحب کہا ہے اور ابو نصر القشیری نے بھی اپنی تفسیر میں اسی کو صحیح کہا ہے۔ اور یہی راجح قول ہے۔

ج١٣، ص٢٨٣ وفيه ايضاً، قال الشافعي: إنّما يؤمر الحاكم بالمشورة لكون المشير ينبّهه على ما يغفل عنه ويدلّه على ما لا تستحضره من الدليل لا ليقلّد المشير فيما يقوله، فإنّ الله لم يجعل هذا لأحد بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم[24] اهـ ج١٣، ص ٢٨٥ [25]

اور فتح الباری میں ہی شافعی رحمہ اللہ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: حاکم کو مشورے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے تاکہ اسے مشورہ دینے والا اس بات کی طرف توجہ دلائے جس سے وہ غافل ہے۔ یا اس دلیل کی طرف رہنمائی کرے جو اسے مستحضر نہیں نہ کہ اس لیے کہ حاکم مشورہ دینے والے کی اس بات میں تقلید کرے۔ کیونکہ اللہ نے یہ نبی صلی اللہ وعلیہ وسلم کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں کیا۔

وفيه ايضا: عن الشافعي وإذا قاس من له القياس فاختلفوا وسع كلّا أن يقول بمبلغ اجتهاده، ولم يسعه اتباع غيره فيما أدّاه إليه اجتهاده[26]، اهـ ج١٣، ص٢٥٢

مزید شافعی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اور جب مجتہد کسی مسئلہ میں قیاس کرے اور ان میں اختلاف واقع ہو تو ہر ایک کے لیے اتنی وسعت ہے کہ وہ اپنے اجتہاد کے مطابق کہے۔ اور اس مسئلہ میں، جس میں وہ اجتہاد کر چکا ہے، دوسرے مجتہد کے اجتہاد کی اتباع کرنا جائز نہیں۔

---

[23] ایضاً

[24] ایضاً

[25] اس رسالہ میں شافعیہ کے جو اقوال لکھے گئے ہیں وہ قواعدِ حنفیہ کے موافق ہیں۔

[26] فتح الباري، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة۔ باب من شبّه أصلا معلوما بأصل مبيّن، وقد بيّن النبى صلى الله عليه وسلم حكمهما ليفهم السائل۔

اور اگر تھوڑی دیر کے لیے امر مشورہ کو وجوب پر ہی محمول کیا جائے تو پھر سائل کو یہ بتلانا چاہیے کہ مشورہ کرنا صرف علماء حاضرین سے واجب ہے یا غائبین سے بھی؟ یقیناً وہ دوسری شق کو ثابت نہیں کر سکتا اور مسائل حاضرہ میں جو مقدس عالم جمہور سے الگ ہیں ان کی بابت یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے ان مسائل میں ان علماء سے بھی مشورہ نہیں کیا جو ان کے پاس حاضر تھے۔ ہم کو خوب معلوم ہے کہ انھوں نے ان مسائل میں جو رائے قائم کی ہے وہ علماء حاضرین کے مشورہ کے بعد قائم کی ہے، اور دنیا بھر کے علماء کے مشورہ کا وجوب کسی دلیل سے ثابت نہیں۔ لہٰذا ان کو حدیث مجمع الزوائد سے کسی طرح مخالف نہیں کہا جاسکتا۔

رہی دوسری حدیث جو ابن ماجہ سے بروایت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سوال میں مذکور ہے یعنی فإذا رأيتم إختلافاً فعليكم بالسواد الأعظم (پس جب تم اختلاف دیکھو تو سوادِ اعظم کو لازم پکڑو) اور جس کو عزیزی میں ابن ماجہ کے رمز سے نقل کر کے حدیث صحیح کہا ہے، اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ حدیث بروایت ابن ماجہ صحیح نہیں ہے۔ اور عزیزی کا ابن ماجہ کے حوالہ سے نقل کر کے اس کو صحیح کہنا غایت تساہل ہے کیونکہ ابن ماجہ کی سند میں ایک راوی ابو خلف اعمی موجود ہے جس کو ابو حاتم نے منکر الحدیث اور ابن معین نے کذاب کہا ہے۔

ففي تهذيب التهذيب: في ترجمته قال أبو حاتم: منكر الحديث ليس بالقوى۔ الیٰ ان قال۔ ونقل ابن الجوزي عن ابن معين أنه قال فى الاعمى الراوي عن أنس كذاب وجزم الدارقطني في الأفراد بأن اسم أبي خلف الراوي عن أنس حازم بن عطاء وأنه تفرد بالحديث الذي أخرجه ابن ماجة۔[27] اھ ج۱۲، ص۸۸، ۷۸

مشکوٰۃ میں اس حدیث کو ابن عمر کی طرف منسوب کر کے دوسرے الفاظ میں نقل کیا ہے، لیکن کسی کتاب کا حوالہ نہیں لکھا، بلکہ بیاض چھوڑ دی ہے۔ میرک شاہ نے اس میں رواہ ابن ماجہ عن انس ملحق کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث بروایت ابن عمر ان کو نہیں ملی اور حدیث انس کا ضعیف ہونا معلوم ہو چکا ہے، لہٰذا یہ بھی کچھ مفید نہ ہوئی۔

لیکن مقاصد حسنہ میں حدیث لا يجمع امتي على ضلالة کے طرق جمع کرتے ہوئے حافظ سخاوی نے فرمایا ہے:

---

[27] تهذيب التهذيب۔ الجزء الثاني عشر۔ باب الكنى۔ حرف الخاء

وأبو نعيم فی الحلية والحاكم في مستدركه وأعله واللالكائي في السنة وابن منده ومن طريقة الضياء فی المختارة عن ابن عمر رفعه: إن الله لا يجمع هذه الأمة على ضلالة أبداً وإن يد الله مع الجماعة فاتبعوا السواد الأعظم فإنه من شذ شذ فی النار، وهكذا هو عد الترمذي لكن بلفظ: هذه الأمة، أو قال: أمتي، [۲۸] اھ، ص۲۱۵

اس سے معلوم ہوا کہ ابن عمر سے اس حدیث کو ضیاء مقدسی نے بھی مختارہ میں نقل کیا ہے اور اس کے الفاظ قریب قریب مشکوٰۃ ہی کے الفاظ ہیں، لیکن اس پر کلام یہ ہے کہ ترمذی نے ابن عمر سے جس سند کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے اس میں ایک راوی سلیمان بن سفیان متفق علیہ ضعیف و منکر الحدیث ہے۔ تہذیب میں کسی سے بھی اس کی توثیق نقل نہیں کی۔ إلى ان قال و ذكره ابن حبان فی الثقات وقال كان يخطی۔ اور عبد اللہ بن دینار سے تو اس کی روایت خصوصیت کے ساتھ منکر ہے۔

قال ابو زرعة منكر الحديث روى عن عبدالله بن دينار ثلثة احاديث كلها يعني مناكير اھ (ج۴، ص۱۹۴) ترمذی نے حدیث بیان کر کے کہا ہے کہ هذا حديث غريب من هذا الوجه وسليمان المدينی هو عند سليمان بن سفيان اھ (ج۲، ص۳۹) [۲۹]

پس اگر ضیاء مقدسی نے بھی مختارہ میں اسی سند سے حدیث کو روایت کیا ہے تب تو وہ ہر گز قابل احتجاج نہیں اور اگر دوسری سند سے نقل کیا ہے تو یہ معلوم نہیں کہ ضیاء مقدسی کے الفاظ کیا ہیں کیونکہ اصحاب اطراف و جامعین طرق کی عادت ہے کہ وہ فی الجملہ مشارکۃ معنی سے ایک حدیث کو متعدد مخرجین کی طرف منسوب کر دیتے ہیں حالانکہ الفاظ ہر ایک کے جدا جدا ہوتے ہیں۔

چنانچہ اسی جگہ حافظ سخاوی نے اس حدیث کو ترمذی کی طرف منسوب کیا ہے۔ حالانکہ ترمذی میں فاتبعوا السواد الأعظم کا لفظ نہیں ہے۔ مگر چونکہ حافظ کو لا يجمع أمتي على ضلالة کے طریق کا بیان کرنا مقصود ہے اور یہ

---

[۲۸] المقاصد الحسنة للسخاوي۔ حرف لام ألف

[۲۹] ليس عن الترمذي قوله فاتبعوا السواد الاعظم

مضمون ترمذی میں تھا، اس لیے اس حدیث کو ترمذی کی طرف منسوب کر دیا تو ممکن ہے کہ اسی طرح ضیاء فی المختارہ نے بھی لا يجمع أمتي على ضلالة کے مضمون کو بدون لفظ فاتبعوا السواد الأعظم کے روایت کیا ہو، اس لیے ضیاء مقدسی کے مختارہ کی طرف اسی حدیث کا منسوب ہونا بلفظ مذکور اس کی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

اور اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ حافظ سخاوی نے حدیثِ ابن عمر کو جن الفاظ سے نقل کیا ہے ضیاء مختارہ کے بھی الفاظ ہیں تب بھی یہ حدیث سائل کو مفید نہیں، کیونکہ اس میں اختلاف کا ذکر نہیں جس سے یہ مضمون مستنبط کیا جائے کہ اختلاف علماء کے وقت سواد اعظم کا اتباع واجب بلکہ اس سے سواد اعظم کا وجوب بطریق اطلاق ثابت ہوتا ہے جو ہمارے نزدیک حالت اتفاق پر محمول ہے، یعنی جب سواد اعظم یعنی جمیع علماء امت کسی مسئلہ پر اتفاق کر لیں تو اس کا اتباع واجب ہے اور اس سے اجماع کی حجیت ثابت ہوتی ہے نہ کہ اختلاف علماء کے وقت قول جمہور کی حجیت!

اختلاف کے وقت سواد اعظم کا اتباع ہونا صرف ابن ماجہ کی حدیث سے معلوم ہو رہا ہے جس کا ضعیف ہونا اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ اور حافظ سخاوی نے ابن ماجہ کے ساتھ مسند عبد کی طرف بھی ان الفاظ کو منسوب کیا ہے۔ مگر مسند عبد کی سند معلوم نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ مسند عبد میں بھی یہ حدیث بروایت انس ہے جس سے ظاہر یہ ہے کہ اس میں بھی ابو خلف اعمی موجود ہے۔ کیونکہ دار قطنی نے حدیث انس مذکور فی ابن ماجہ کو افراد ابی خلف سے بتایا ہے۔ لہٰذا بایں الفاظ یہ حدیث حجت نہیں ہو سکتی، اور بعد تسلیم کے ہم یہ کہتے ہیں کہ حدیث ابن ماجہ سے بھی سائل کا مدعی حاصل نہیں کیونکہ اس میں بھی یہ تصریح نہیں کہ جب علماء میں اختلاف ہو تو علماء کی جماعت کثیرہ کا اتباع لازم ہے بلکہ اس کا مضمون اس قدر ہے کہ میری امت ضلالت پر مجتمع نہیں ہو سکتی پس جب تم اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کا اتباع کرو۔

ہمارے نزدیک سواد اعظم سے صرف علماء مراد ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جب جہلائے امت علماء سے اختلاف کریں تو علماء کا اتباع واجب ہے۔ یہ مطلب اس سے نہیں نکلتا کہ علماء میں اختلاف ہو تو ان کی جماعت کثیرہ کا اتباع لازم ہے، بلکہ علماء میں سے ہر واحد کا اتباع جائز ہے خواہ وہ واحد ہو یا جماعت کثیرہ۔ کیونکہ ہم اس سے پہلے زاد المعاد کی عبارت

نقل کر چکے ہیں کہ صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے وقت سے اس وقت تک مخالفت جمہور کے جواز پر اجماع ہو چکا ہے اور کسی نے کسی امام کا قول یہ کہہ کر رد نہیں کیا کہ یہ قول جمہور کے خلاف ہے اس لیے رد ہے۔

لہٰذا اس حدیث ضعیف کو اسی معنی پر محمول کرنا واجب ہے جو ہم نے بیان کیے ہیں، تاکہ اجماع کی مخالفت لازم نہ آئے فافهم۔ اور **علماء کا ہی اختلاف مراد ہو تو اس میں اختلاف فی الفروع مراد نہیں بلکہ اختلاف فی الأصول والاعتقادیات مراد ہے** جیسا کہ مرقاۃ سے یہی تفصیل ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ مرقاۃ میں اس کے بعد سواد اعظم کے چند معنی اور لکھے ہیں:

وقيل المراد جمع المسلمين الذين هم في طاعة الإمام وهو السلطان الأعظم اهـ۔	اس صورت میں اختلاف مذکور فی الحدیث سے امور انتظامیہ میں اختلاف مراد ہوگا نہ کہ مسائل شرعیہ میں۔ اس کے بعد لکھا ہے:
وقيل كل عالم عامل بالكتاب والسنة فى الأزهار اتبعوا السواد الأعظم يدل على أن أعاظم الناس العلماء ء وإن قل عددهم ولم يقل الأكثر لأن العوام والجهال أكثر عددا[30] اهـ ج١، ص٢٠٦	اس سے یہ معلوم ہوا کہ سواد اعظم سے ہر وہ عالم مراد ہے جو کتاب و سنت پر عامل ہو نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ کثرت قائلین معتبر نہیں کیونکہ کثرت تو جہال ہی کی ہے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سواد اعظم فرمایا، سواد اکثر نہیں فرمایا۔ اور بعض علماء نے سواد اعظم کی تفسیر کو صحابہ کے ساتھ خاص کیا ہے۔ لہٰذا اتنے احتمالات کے ہوتے ہوئے یہ حدیث جس کی صحت پر بھی کلام ہے کسی طرح سائل کو مفید نہیں ہو سکتی۔

رہی تیسری حدیث جو سائل نے ترمذی سے نقل کی ہے؛ عليكم بالجماعة وإيّاكم والفرقة اس سے اجماع علی الامام مراد ہے۔ یعنی جب ایک جماعت مسلمانوں کی کسی شخص کو امام تسلیم کر لے تو ان سے اختلاف مت کرو۔ اس

---

[30] مرقاة الفاتيح شرح مشكاة المصابيح۔ كتاب الإيمان۔ باب الاعتصام بالكتاب والسنة

سے بھی امور انتظامیہ میں اتباع جماعت کا امر معلوم ہوا بشرط یہ کہ مسلمانوں کا کوئی امام بھی ہو اور دلیل اس مراد کی بخاری کی یہ حدیث ہے:

من رأى من أميره شيئاً يكرهه فليصبر عليه فإنّه من فارق الجماعة شبراً فمات إلّا مات ميتةً جاهلية[٣١] اھ۔ ج١٣، ص٥ فتح الباري

اس حدیث میں مفارقت عن الجماعۃ کی وعید کو صبر علی الامام پر مرتب فرمانا صاف بتلا رہا ہے کہ جس مفارقت جماعت کی ممانعت ہے وہ امام سے مفارقت ہے۔ پس عليكم بالجماعة وإيّاكم والفرقة کا مطلب بھی واضح ہو گیا کہ موافقت امام کا امر ہے اور اس کی مخالفت اور مفارقت سے ممانعت ہے۔

ہم پہلے فتح الباری کے حوالہ سے بیان کر چکے ہیں کہ طبری نے عليكم بالجماعة کی اس تفسیر کو صواب قرار دیا ہے۔ اور بعض علماء نے جماعت سے خاص جماعت صحابہ کو مراد لیا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث بھی اس مضمون پر کسی طرح دلالت نہیں کرتی کہ اختلاف علماء کے وقت جماعت کثیرہ کا اتباع واجب ہے اور جماعت قلیلہ یا عالم واحد کا اتباع جائز نہیں۔

اب میں چند واقعات پر اس بحث کو ختم کرنا چاہتا ہوں؛ جن سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مسائل شرعیہ میں کثرت کی رائے پر حقانیت کا مدار نہیں رکھا گیا، بلکہ ہمیشہ قوت دلیل پر مدار رکھا گیا ہے۔ گو وہ شخص واحد کا قول ہو یا جماعت قلیلہ کا۔

ا۔ اُساریٰ بدر کے واقعہ میں حضرت عمر و سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی رائے تمام صحابہ کے خلاف تھی اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مبارک بھی عام آراء کے ساتھ تھی مگر وحی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے موافق فیصلہ ہوا، کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار نہیں کیا گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کبھی مفضول کی

---

[٣١] صحيح البخاري۔ كتاب الفتن۔ باب قول النّبي صلى الله عليه وسلم: سترون بعدي أموراً تنكرونها

رائے فاضل کی رائے سے اصوب ہو سکتی ہے، گو اس کو بھی فاضل کا فعل شمار کیا جائے۔ حدیث پر نظر رکھنے والے اس واقعہ کو خوب جانتے ہیں۔

۲۔ جنگ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس آدمیوں کو ایک مورچہ کی حفاظت کے لیے متعین فرمایا اور ان سے یہ فرمایا تھا کہ تم کسی حال میں یہاں سے نہ ہٹنا خواہ ہم پر کچھ بھی حالت گزر جائے۔ جب مسلمانوں کا لشکر کفار پر غالب آگیا اور اہل مکہ بے تحاشا بھاگنے لگے تو ان پچاس آدمیوں میں اختلاف ہوا۔ اکثر کی رائے یہ ہوئی کہ اب مورچہ پر رہنے کی کوئی ضرورت نہیں، دشمن مغلوب ہو چکا ہے ہم کو بھی غنیمت کا مال لوٹنا چاہیے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ کسی حال میں یہاں سے نہ ہٹنا بطور مبالغہ و تاکید کے تھا اور مقصد یہ تھا کہ وقتِ ضرورت تک یہاں سے نہ ہٹنا، اب ضرورت نہیں رہی! بعض کی رائے یہ ہوئی کہ نہیں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح ممانعت کے بعد ہمیں یہاں سے نہ ہٹنا چاہیے۔ اس اختلاف کے بعد چالیس آدمیوں نے مورچہ چھوڑ دیا اور دس آدمی وہیں جمے رہے۔ وحی سے ان دس آدمیوں کی رائے صائب (درست) قرار دی گئی اور چالیس کی رائے کو معصیت میں داخل کیا گیا۔

معلوم ہوا کہ اختلاف علماء کے وقت جماعت قلیلہ کی رائے بھی حق ہو سکتی ہے۔ بخاری و فتح الباری سے معلوم ہوتا ہے کہ بجز عبد اللہ بن جبیر کے، جو ان پچاس تیر اندازوں کے افسر تھے اور سب کی بھی رائے ہوئی کہ ہم کو لشکر میں شامل ہو کر غنیمت لوٹنی چاہیے۔

۳۔ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اور دفن کے بعد سب سے پہلا کام حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ اول نے یہ کیا کہ لشکر اسامہ کو شام کی طرف بھیجنا چاہا، جس میں مہاجرین اولین و اجل صحابہ شامل تھے۔ تقریباً تمام صحابہ نے ان کی اس رائے کی مخالفت کی اور عرض یہ کیا کہ اس وقت قبائل عرب میں اختلاف و ارتداد کے آثار ظاہر ہو گئے ہیں، آپ کو اس لشکر کے مدینہ میں رکھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ مگر حضرت صدیق اکبر نے یہ کہہ کر ان کی رائے کو رد کر دیا:

والله! لا أحل راية عقدها رسول الله صلى الله عليه وسلم[۳۲]

”بخدا میں اس جھنڈے کو کبھی نہ کھولوں گا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے باندھا ہے۔“

اور ابن اثیر نے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

والذي نفسي بيده لو ظننت أن السباع تختطفني لأنفذت جيش أسامة كما أمر النبي صلى الله عليه وسلم[۳۳] اھ ج۲، ص۱۶۱

”قسم اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ اگر مجھ کو اس کا بھی یقین ہو جائے کہ اس لشکر کے بھیجنے کے بعد مجھ کو درندے پھاڑ ڈالیں گے، تب بھی میں جیشِ اسامہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق بھیج کر رہوں گا۔“

چنانچہ لشکر روانہ ہوا اور کسی صحابی نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ کہنے کی جرأت نہ کی کہ یہ مسئلہ اختلافی ہو گیا ہے اس میں آپ کو تنہا اپنی رائے پر نہ اڑنا چاہیے، جماعت کے مشورہ پر عمل کرنا چاہیے۔ بلکہ بعد میں سب کو اقرار کرنا پڑا کہ جیش اسامہ کے بھیجنے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے صحیح تھی۔ دیکھو کامل ابن اثیر ج۲، ص۱۶۲

۴۔ اسی طرح حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے وصال نبوی کے بعد یہ ہوئی کہ جن قبائل نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا ہے ان پر جہاد کیا جائے۔ اس میں بھی تمام صحابہ کی رائے ان کے خلاف تھی کہ جب وہ لوگ کلمۂ توحید و رسالت کا اقرار کرتے ہیں تو ان سے چند اونٹوں اور بکریوں کے لیے کیونکر جہاد کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے سے مخالفت کی اور یہ کہا کہ آپ کو اس معاملہ میں نرمی اور تالیفِ

---

[۳۲] امداد الاحکام میں رایة کے لفظ کی جگہ لواء مذکور ہے۔ چونکہ البداية والنهاية ((سنة إحدى عشرة من الهجرة، باب ذكر عبيده عليه الصلاة والسلام وإمائه وذكر خدمه وكتابه وأمنائه)) میں رایة ملا ہے، اس لیے اسے ذکر کیا گیا ہے۔

[۳۳] الكامل فى التاريخ لإبن أثير۔ المجلد الثانى، ذكر أحداث سنة إحدى عشرة۔ ذكر إنفاذ جيش أسامة بن زيد

قلوب سے کام لینا چاہیے۔ جس کا جواب نہایت سختی کے ساتھ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان لفظوں میں دیا:

أجبار فى الجاهلية وخوار فى الإسلام؟ إنه قد انقطع الوحي وتم الدين أينقص وأنا حي؟ رواه رزين مشكوٰة ج١، ص۲۷۵

”اے عمر! یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو ایسے زبردست تھے اور اسلام میں اتنے بودے! وحی منقطع ہو چکی ہے اور دین مکمل ہو چکا، تو کیا میری زندگی ہی میں اس میں نقصان آ جائے گا؟“

بالآخر صحابہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے کے آگے گردنیں جھکا دیں اور کسی نے جرأت کر کے یہ عرض نہ کیا کہ مسئلہ اختلافی ہو گیا ہے، اس میں آپ کو جماعت کثیرہ کی رائے پر عمل کرنا چاہیے، تنہا اپنی رائے کو نہ چلانا چاہیے۔ بلکہ بعد میں صحابہ نے اس کا اقرار کیا کہ اگر اس وقت ابو بکر نہ ہوتے تو ہم سب ہلاکت میں پڑ چکے تھے۔

قال عبدالله بن مسعود: لقد قمنا بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم، مقاماً كدنا نهلک فيه لولا أن الله منّ علينا بأبي بكر، أجمعنا على أن لا نقاتل على ابنة مخاض وابنة لبون، وأن نأكل قرى عربية ونعبد الله حتى يأتينا اليقين، فعزم الله لأبي بكر على قتالهم، الخ۔ كامل ابن الاثير ج٢، ص١٦٥[٣٤]

اس واقعہ سے فقہاء کے اس قول کی تائید ہو گئی کہ خلاف واحد بھی قادح اجماع ہے کیونکہ اس وقت بجز صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اور تمام صحابہ کی رائے تھی کہ مانعین زکوۃ سے قتال نہ کرنا چاہیے۔ مگر سب کی رائے غلط تھی اور حضرت صدیق ہی کی رائے صواب تھی۔

نیز ان واقعات سے ان لوگوں کو بھی اپنی غلطی کی اصلاح کرنی چاہیے جو یوں کہتے ہیں کہ اسلام نے جمہوری حکومت کی تعلیم دی ہے۔ وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ ارسال جیشِ اسامہ و قتال اہل ردّت کے معاملے میں حضرت صدیق اکبر

---

[٣٤] الكامل فى التاريخ لإبن أثير۔ المجلد الثانى، ذكر أحداث سنة إحدى عشرة۔ ذكر خبر طليحة الأسدي

رضی اللہ عنہ نے کس دلیری کے ساتھ اپنی شخصی رائے پر عمل کیا اور تمام صحابہ نے کس اخلاص کے ساتھ ان کی رائے کا اتباع کیا۔

اسلام میں یہ تعلیم ضرور ہے کہ خلیفہ و امام جماعت مسلمین کے مشورہ سے مقرر ہونے چاہییں، بشرط یہ کہ خلیفۂ سابق نے کسی کو اپنی نیابت و خلافت کے لیے نامزد نہ کیا ہو، ورنہ پھر مشورہ کی ضرورت نہیں بلکہ خلیفہ کا مقرر کردہ شخص اگر نااہل نہ ہو تو سب سے مقدم ہوگا۔ بعد خلیفہ مقرر ہو جانے کے تمام نظم و نسق سلطنت کا اس کی ذاتی رائے پر ہوگا۔ البتہ خلیفہ کو اصحاب علم و فہم سے مشورہ کرتے رہنا مستحب ہے، لیکن مشورہ کا قبول کرنا اس کے ذمہ لازم نہیں۔ اگر اس کی رائے مشیرین کی رائے سے موافقت کر جائے تو قبول کر لے ورنہ اپنی رائے پر عمل کرنے کا اسے کامل اختیار ہے، اور مسلمانوں کو اس کا اتباع واجب ہے، بشرط یہ کہ اس میں کوئی معصیت لازم نہ آتی ہو۔

لانه لا طاعةَ لِمخلوقٍ في معصيةِ الخالق ومر ذكره سابقاً فتدبر۔[۳۵]

۵۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جو مشاجرات ہوئے ان میں تقریباً تمام صحابہ کی رائے تھی کہ صاحبِ حق کی اعانت کرنا چاہیے۔ چنانچہ جس طرح ان کی ایک بڑی جماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی، اسی طرح کثیر جماعت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی تھی۔ لیکن معدودے چند صحابہ کی یہ رائے تھی کہ دونوں سے الگ رہنا چاہیے، جیسے عبد اللہ بن عمر، ابو موسیٰ اشعری، ابو مسعود انصاری، ابو بکرہ اور احنف بن قیس (رضی اللہ عنہم اجمعین)۔ مگر کہیں یہ بات ثابت نہیں کہ ان معدودے چند حضرات کو کسی نے مخالفتِ جمہور کی وجہ سے فاسق و فاجر یا بزدل کا خطاب دیا ہو۔

---

[۳۵] یویده قوله تعالیٰ وشاورهم فی الأمر فاذا عزمت فتوكل على الله لم يقل فاذا عزمتم فدل على ان الامام يستبد فی العزم بعد الشورى وليس للمشيرين فی العزم بنصيب

معلوم ہوا کہ مسائل شرعیہ میں جمہور کا قول و فعل حجت ملزمہ نہیں ہے۔ ورنہ یہ معدودے چند صحابہ جمہور کی مخالفت نہ کرتے۔ نیز معلوم ہوا کہ اگر کسی عالم کا قول جمہور کے خلاف ہو تو وہ فاسق وغیرہ نہیں بن جاتا، بلکہ ممکن ہے کہ اسی کی رائے صواب ہو اور جمہور کی رائے غلط ہو۔[۳۶]

۶۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد بجز عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ و امام حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے تمام صحابہ و تابعین نے یزید کی بیعت قبول کر لی تھی اور اجلہ صحابہ نے امام حسین رضی اللہ عنہ کو یزید پر خروج کرنے سے بہت زور کے ساتھ منع بھی فرمایا تھا، جبکہ تاریخ دیکھنے والوں سے یہ واقعہ مخفی نہیں۔ پس اگر کثرتِ رائے پر حق و باطل کا مدار کیا جائے اور مشورۂ جماعتِ کثیرہ پر عمل کو واجب کہا جائے تو نعوذ باللہ حضرت امام سبط رسول کا باطل پر ہونا لازم آئے گا اور اس کو ہر گز کوئی مسلمان قبول نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوا کہ قولِ جمہور حجت ملزمہ شرعیہ نہیں بلکہ اس کی مخالفت جائز ہے۔ اور ممکن ہے کہ جمہور کے خلاف جماعتِ قلیلہ یا شخصِ واحد کی رائے صحیح ہو۔

مامون الرشید خلیفہ عباسی نے جس وقت خلق قرآن مسئلہ میں علماءِ وقت کا امتحان لیا تو بجز احمد رحمۃ اللہ علیہ کے اور سب علماء نے طوعاً یا کرھاً یا توریۃً قرآن کو مخلوق کہہ دیا تھا۔ چنانچہ بجز امام کے اور سب رہا کر دیے گئے اور حضرت امام احمد بن حنبل کو سالہا سال حبس اور ضرب کی مصیبت جھیلنا پڑی۔ اگر کثرتِ رائے پر حق کا مدار ہو تو امام احمد بن حنبل کا قول غلط ہونا چاہیے، حالانکہ امت مابعد کا اجماع ہے کہ اس مسئلہ میں امام ہی کا قول صحیح ہے اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اگر امام بھی قرآن کو مخلوق کہہ دیتے تو ہمیشہ کے لیے ساری امت اسی غلط مسئلہ کی قائل ہو جاتی۔ معلوم ہوا کہ جمہور کے خلاف قولِ شخصِ واحد صحیح ہو سکتا ہے۔

---

[۳۶] قال القاضي الشوكاني فى النيل قال فى الفتح وقد اجمع الفقهاء على وجوب طاعة السلطان المتغلب والجهاد معه وان طاعته خير من الخروج عليه لما في ذلک من حقن الدماء وتسكين الدهماء ولم يستثنوا من ذالک الا اذا وقع من السلطان الكفر الصريح فلا تجوز طاعته في ذلک بل تجب مجاهدته لمن قدر عليها كما فى الحديث اھ ولكنه لا ينبغى لمسلم ان يحط على من خرج من السلف الصالح من العترة وغيرهم على ائمة الجور فانهم فعلو ذلک باجتهاد منهم وهم اتقى الله واطوع لسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم فمن جاء بعدهم من اهل العلم اھ ج۴، ص۸۴

۸۔ انوار ساطعہ میں عبد السمیع رام پوری نے جواز مولد نبوی بهئية كذائيه مبتدعه و استحسان قيام بوقت ذكر ولادت شريفه نبويه على صاحبها افضل الصلاة والتحية پر علاوہ دیگر دلائل کے ایک دلیل یہ بھی لکھی تھی کہ اس پر جمہور علماء حرمین و مصر و عراق و شام و ہند کا اتفاق ہو چکا ہے، لہٰذا اس کی ممانعت اجماع کی ممانعت ہے۔ اس کے جواب میں حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی قدس سرہ نے علاوہ دیگر جوابات کے ایک یہ بات بھی لکھی ہے کہ جن علماء کے اتفاق کا انوار ساطعہ میں حوالہ دیا گیا ہے، مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری ان کے ہم عصر ہیں اور ان کا فتویٰ اس کے خلاف ہے، لہٰذا یہ اتفاق قابلِ اعتبار نہیں۔ کیونکہ خلاف عالمِ واحد بھی قادح اجماع ہے؛ ملاحظہ ہو براہین قاطعہ! معلوم ہوا کہ جمہور علماء کا کسی مسئلہ میں اتفاق کر لینا جب کہ ایک عالم محقق بھی ان کے خلاف ہو، حجت نہیں اور شخصِ واحد کا قول بھی جمہور کے خلاف صحیح ہو سکتا ہے۔

۹۔ روى البخاري عن عبدالله بن عمرو فسمعته يقول: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إنّ الله لا ينزع العلم بعد أن أعطاكموه انتزاعاً ولكن ينتزعه منهم مع قبض العلماء ء بعلمهم فيبقى ناسٌ يستفتون فيفتون برأيهم فيضلون ويضلون اهـ فتح الباري ج۱۳، ص۲۴۱۔[۳۷]

قال الحافظ في شرحه وقد أخرج ابن عبد البرّ في "كتاب العلم" من طريق عبدالله بن وهب سمعت خلّاد بن سلمان الحضرمي يقول حدّثنا درّاج أبو السّمح يقول: "يأتي على النّاس زمان يسمّن الرّجل راحلته حتّى يسير عليها فى الأمصار يلتمس من يفتيه بسنّةٍ قد عمل بها، فلا يجد إلّا من يفتيه بالظّنّ"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک زمانہ میں علماء کم ہو جائیں گے اور جہلا ہی زیادہ رہ جائیں گے، لوگ جہلا کو سردار بنا لیں گے اور ان سے استفتاء کریں گے۔ وہ محض اپنی رائے سے ان کو جواب دیں گے، جس سے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیں گے۔

اور حافظ ابن حجر کے قول سے معلوم ہوا کہ یہ حالت اس زمانہ میں ہو گی جب کہ اجتہاد مطلق ختم ہو جائے گا اور اجتہاد مقید باقی رہ جائے گا یا ایسے مقلدین رہ جائیں گے جن میں بعض اجتہاد مقید کے قریب ہوں گے۔ اس زمانہ میں غالب حالت یہی ہو گی جو حدیثِ مذکور میں ہے۔ گو بعضے سنت کے موافق جواب دینے

---

[۳۷] صحيح البخاري۔ كتاب الاعتصام بالكتاب والسنّة۔ باب ما يذكر من ذمّ الرّأي

فيحمل على أنّ المراد الأغلب الأكثر في الحالين، (اى في حال وجود المجتهدين المقيدين وبقاء المقلدين الأقربين الى بلوغ درجة الاجتهاد المقيد كما يفهم من كلامه سابقاً) وقد وجد هذا مشاهداً ثمّ يجوز أن يقبض أهل تلك الصّفة ولا يبقى إلّا المقلّد الصّرف، وحينئذٍ يتصوّر خلوّ الزّمان عن مجتهد حتّى في بعض الأبواب بل في بعض المسائل، ولكن يبقى من له نسبة إلى العلم فى الجملة، ثمّ يزداد حينئذٍ غلبة الجهل وترئيس أهله، ج۱۳، ص۲۴۳۔ [۳۸]

والے بھی ہوں گے، پھر بھی ممکن ہے کہ یہ حالت بھی رہے۔ اور بعض ابواب بلکہ بعض مسائل میں بھی اجتہاد کرنے والے نہ رہیں گے بلکہ صرف خالص مقلدین رہ جائیں جن میں سے بعض ایسے بھی ہوں گے جن کو فی الجملہ علم سے نسبت ہو گی۔ اس وقت جہل کا غلبہ زیادہ ہو جائے گا اور لوگ جہلا کو ہی اپنا سردار بناویں گے۔

میں کہتا ہوں کہ صاحبِ بصیرت پر یہ بات مخفی نہیں کہ یہ زمانہ اسی حالت کا مصداق ہے جس کو حافظ رحمہ اللہ نے سب سے آخر میں بیان کیا ہے، کیونکہ اجتہاد مقید کے درجہ پر کوئی نہیں بلکہ اس کے قریب بھی نہیں۔ پس اکثر علماء محض مقلد ہیں اور حافظ رحمہ اللہ کے قول کے موافق مشاہدہ ہو رہا ہے کہ آج کل جہلا کو زیادہ تر سردار بنایا جا رہا ہے۔ جس نے درسیات ختم کر لیں، محض وعظ و تقریر کی مشق کر لی، اس کو مولانا کا خطاب اور مقتدا کا لقب دے دیا گیا۔ خواہ اس کو قرآن و حدیث کی فہم حاصل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ بلکہ افسوس یہ ہے کہ آج کل تو بعض ان لوگوں کو بھی مقتدا بنایا جاتا ہے جس کو متنبّی اور ابونواس کی طرح عربی لکھنے اور بولنے کی کسی قدر مشق ہو گئی ہو اور ان کا تمام سرمایۂ عمر بجز عربی بولنے اور تاریخ لکھ لینے اور معقول و فلسفہ کی باتیں بیان کر دینے کے کچھ نہیں۔

جہلا تو درکنار افسوس ہے کہ اہل علم بھی ان کے تبحر و ہمہ دانی کے معتقد ہیں۔ حالانکہ قرآن و حدیث اور فقہ سے ان کو ذرا بھی مس نہیں اور عمل کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک حالت یہ ہے کہ بعض لوگ جس کی ساری عمر انگریزی خوانی میں صرف ہوتی ہے، حدیث و فقہ اور تفسیر کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، لیکن فطری طور پر ان کو بیان اور تقریر پر کسی قدر قدرت حاصل ہے، ان کو بھی آج کل مقتدا اور پیشوا مانا جاتا ہے۔ عوام تو عوام، حیرت

---

[۳۸] فتح البارى۔ كتاب الاعتصام بالكتاب والسّنّة۔ باب ما يذكر من ذمّ الرّأي

یہ ہے کہ بعض اہل علم بھی ان کو فخر قوم، مولانا فلاں کے لفظ سے یاد کرتے ہیں اور اپنے قلم سے ان کو مولانا لکھ کر عامۃ المسلمین کو دھوکہ دیتے ہیں، فإلی اللہ المشتکی۔

پس یقیناً یہی وہ زمانہ ہے جس کی نسبت حدیث میں پیش گوئی ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ جہلا کو سردار بنائیں گے جو اپنی رائے سے مسائلِ شرعیہ کا جواب دیا کریں گے جس سے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ ایسے زمانۂ غلبۂ جہل میں کسی طرف علماء کی زیادہ تعداد کا ہونا کیونکر حقانیت کی دلیل ہو سکتی ہے؟

قال الحافظ في شرح البخاري تحت حديث لا تزال طائفة من امتي الخ ناقلا عن النووى ولا يلزم أن يكونوا مجتمعين في بلد واحد، بل يجوز اجتماعهم في قطر واحد وافتراقهم في أقطار الأرض، ويجوز أن يجتمعوا فى البلد الواحد وأن يكونوا في بعض منه دون بعض، ويجوز إخلاء الأرض كلّها من بعضهم أوّلا فأوّلا إلى أن لا يبقى إلّا فرقة واحدة ببلدٍ واحد اه ج۱۳، ص۲۵۱۔ [۳۹]

امام نووی کے قول سے معلوم ہوا کہ کسی وقت ایسا ممکن ہے کہ تمام زمین اہل حق سے خالی ہو جائے اور بجز ایک فرقہ کے جو ایک شہر میں ہو، کوئی حق پر نہ رہے۔ اہلِ انصاف غور فرمائیں کہ جب امت میں ایسی حالت کا ظہور بھی ممکن ہے تو اس وقت کسی طرف جماعتِ کثیرہ کا ہونا ان کی حقانیت کی دلیل کیونکر ہو سکتی ہے؟ پس حدیث اتبعوا السواد الاعظم کا اگر وہ مطلب بھی تسلیم کر لیا جاوے جو بعض لوگ بیان کرتے ہیں تو اس کو زمانہ خیر القرون پر محمول کرنا لازم ہے تا کہ دیگر حدیث سے معارضہ لازم نہ آئے۔

بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

فإنّه لايأتي عليكم زمان إلّا الّذي بعده شرٌّ منه حتّى تلقوا ربّكم سمعته من نبيّكم صلّى الله عليه وسلم۔ فتح الباري، ج۱۳، ص۱۷۔ [۴۰]

”جو زمانہ آتا ہے اس سے اگلا زمانہ اس سے بدتر ہوتا ہے، یہاں تک کہ تم خدا تعالیٰ سے ملاقات کرو۔ میں

---

[۳۹] فتح الباری۔ كتاب الاعتصام بالكتاب والسّنّة۔ باب لا تزال طائفة من أمّتي ظاهرين على الحق

[۴۰] صحيح البخاري۔ كتاب الفتن۔ باب لا يأتي زمانٌ إلّا الّذي بعده شرٌّ منه

نے اس کو تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔" انتہیٰ فتح۔

اس سے معلوم ہوا کہ زمانۂ نبوت سے جس قدر بُعد ہوتا جاتا ہے غلبۂ شر ہوتا جاتا ہے۔ پھر ایسی حالت میں جس طرف قائلین کی کثرت ہو اس طرف خیر اور حقانیت ہونے کی کیا دلیل ہے اور جماعتِ قلیلہ یا شخصِ واحد کے قول کو محض مخالفتِ جمہور کی بنا پر غلط کیونکر کہا جا سکتا ہے؟

جب تک کوئی دلیل شرعی قطعی یا ظنی اس پر قائم نہ کی جاوے، محض مخالفت جمہور غلطی کی دلیل نہیں شرعاً!

والله اعلم وعلمه اتم واحكم وهذا اخير ما اردت ايراده في هذه العجالة وصلى الله على سيّدنا محمد خاتم فص الرسالة وعلى آله وأصحابه رجال الامانة وليوث اليسالة والحمدلله اولا و آخراً وباطناً وانا العبد المفتقر الى رحمة الى الصمد عبد المذنب۔

ظفر احمد وفقه الله لتزود لغد وغفرله ولوالديه ولمشايخه واخوانه واقربائه واخلائه يوم لا يجزى والد عن ولده ولا يغنى أحد عن أحد فقط

تمت۔ يكم ذى الحجة الحرام 1340ھ

☆☆☆☆☆